تعلیم و تربیت
اگست
1989ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

السلام علیکم

آپ سب کو پاکستان کی پیالیسویں سال گرہ مبارک ۔ خداوند تعالیٰ ہمارے اِس پاک وطن کو سدا شاد و آباد رکھے اور ہمیں توفیق دے کہ ہم اپنے کِردار و عمل سے اسے صحیح معنی میں پاکستان بنائیں ، یعنی پاک اور صاف لوگوں کی سرزمین ۔ آمین!

آپ کو تعلیم و تربیت کی ہر چیز پسند آتی ہے ۔ نہیں پسند آتے تو لطیفے ۔ کوئی کہتا ہے گِھسے پِٹے ہیں ۔ پہلے بھی کئی بار پڑھ چکے ہیں ۔ کوئی کہتا ہے کہ نئے تو ہیں مگر بالکل بور اور پُھس پُھسے ہیں ۔ اِس سے تو بہتر تھا کہ نہ ہی چھاپتے ۔ فضول ایک صفحہ ضائع کیا ۔

اب ہماری سُنیے ۔ ہمیں لطیفے دو ذریعوں سے ملتے ہیں ۔ ایک تو وہ لطیفے جو بچّے بھیجتے ہیں ، اور دُوسرے وُہ لطیفے جو ہم مختلف انگریزی رسالوں سے ترجمہ کرتے ہیں ۔ دو تین سال پہلے تک اِن رسالوں سے بہت سے چٹپٹے اور مزے دار لطیفے مِل جاتے تھے ۔ لیکن اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اِن کے اڈیٹروں کے دماغ کو بھی پھپھوندی (اُبلی) لگ گئی ہے ۔

اِس وقت ہمارے پاس 200 کے لگ بھگ لطیفے ہیں ۔ لیکن ان میں سے ایک بھی ایسا نہیں جسے پڑھ کر ہونٹوں پر ہلکی سی مُسکراہٹ ہی آجائے ۔ قہقہہ تو دُور کی بات ہے ۔ چناں چہ اِس مہینے ہم نے لطیفے نہیں چھاپے ۔ اِن کی جگہ ایک صفحے کی بڑی ہی مزے دار اور دِل چسپ کہانی شائع کی ہے ۔ ہمیں یقین ہے کہ یہ کہانی آپ کو لطیفوں کی کمی محسوس نہیں ہونے دے گی ۔

نعت شریف
جہاں بھر کے رہبر ہمارے نبیؐ ہیں
زمانے سے بہتر ہمارے نبیؐ ہیں
یہ شمس و قمر اُنؐ کے دم سے ہیں روشن
مُنوّر، مُنوّر ہمارے نبیؐ ہیں
دل و جاں سے بڑھ کر وہ ہم کو ہیں پیارے
خُدا کے پیمبرؐ ہمارے نبیؐ ہیں
نبی سب کے سب آپؐ کے مُقتدی ہیں
رسولوں کے سرور ہمارے نبیؐ ہیں
جنھیں عرش پر خُود خُدا نے بُلایا
جو رُتبے میں برتر، ہمارے نبیؐ ہیں
میں راہیؔ نہ کیوں کر درُود اُن پہ بھیجوں
کہ اللّٰہ کے پیارے ہمارے نبیؐ ہیں
فضلِ ربیّ راہی

ایک بہادُر عورت

میرزا ادیب

چودہ اگست کی رات کا ابتدائی حصہ بیت رہا تھا۔ ہر طرف مکانوں کی منڈیروں پر روشنی ہی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ کہیں کہیں اُونچی عمارتوں کی دیواروں پر بجلی کے رنگارنگ بلب قوسِ قزح کا سا سماں پیدا کر رہے تھے۔ وجیہ، ساحرہ اور انیزہ نے اپنے مکان کی چھت پر ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک موم بتیاں جلادی تھیں اور اب وہ فارغ ہو کر انکل عزیز کا اِنتظار کر رہے تھے۔ انکل عزیز ان کے کوئی رشتے دار تو نہیں تھے مگر چونکہ ان کے ابا جان کے بہت اچھے دوست تھے اس لئے وہ انہیں اپنا انکل ہی سمجھتے تھے۔

انکل عزیز گیارہ برس امریکا میں گزارنے کے بعد واپس پاکستان آگئے تھے اور آج رات کھانا اُن کے ہاں کھا رہے تھے۔ تینوں بچے بہت خوش تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ان کے انکل ان کے لئے امریکا سے اچھے اچھے تحفے لائے ہوں گے۔ پہلے بھی انہوں نے دو مرتبہ انہیں امریکا سے تحفے بھجوائے تھے۔

تینوں بچے بار بار چھت کی منڈیر کے اُوپر سے نیچے دیکھتے تھے کہ انکل کی گاڑی آئی یا نہیں۔ ابھی تک انہیں گاڑی دکھائی نہیں دی تھی۔

"انکل ابھی تک کیوں نہیں آئے"؟ انیزہ نے پوچھا۔

"اب تک تو انہیں آجانا چاہئیے تھا" ساحرہ نے کہا۔

"ضرور آئیں گے۔ ابا جان نے بتایا تھا، سات بجے آئیں گے اور ابھی سات کہاں بجے ہیں"؟ وجیہ نے انہیں تسلی دی۔

"سات بج گئے ہیں" انیزہ بولی۔

"نہیں بجے" وجیہ کا جواب تھا۔

"بج چکے ہیں" ساحرہ نے اپنی بہن کی تائید کی۔ اور اس سے پیشتر کہ وجیہ کچھ کہے، گاڑی کے ہارن کی آواز آئی۔

"آگئے"! تینوں بولے اور تیزی سے سیڑھیوں سے اُترنے لگے۔

انکل عزیز نے سب کو پیار کیا۔ انہوں نے اِن بچّوں کو اُس وقت دیکھا تھا جب وہ بہت چھوٹے تھے۔ کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ پھر ابا جان بولے "میرا خیال ہے کھانا تیار ہے۔ پہلے کھا لیں۔ پھر باتیں ہوں گی"۔ سب کھانے کی میز کے گرد بیٹھ گئے۔

کھانا کھانے کے بعد ڈرائنگ روم میں چلے گئے۔ انکل عزیز نے بچّوں کو تحفے دیے تو انہیں بہت خوشی ہوئی۔ بڑے خُوب صُورت اور پیارے تحفے تھے۔

"کیوں، بھئی۔ خوش ہو یہ تحفے لے کر"؟ انکل عزیز نے پوچھا۔

"بہت بہت خوش ہیں، شکریہ، انکل" تینوں بیک وقت بول اٹھے۔

"تمہارے لئے ایک اور تحفہ بھی لایا ہوں"۔ یہ سن کر تینوں انکل کا چہرہ دیکھنے لگے۔

"اب تم پوچھو گے کہ وہ تحفہ کیا ہے۔ پوچھو گے نا"؟

"جی ہاں" تینوں بول پڑے۔

انکل ذرا مسکرائے اور کہنے لگے "جو تحفہ میں تمہیں دینا چاہتا ہوں وہ کوئی کھلونا یا اسی قسم کی کوئی چیز نہیں ہے۔ یہ ایک سچی کہانی ہے"۔

"سچی کہانی"؟

"ہاں۔ سچی کہانی"۔

"تو سنائیے، انکل"۔

"ابھی نہیں۔ میں کھانا کھانے کے بعد تھوڑی دیر چہل قدمی کرتا ہوں۔ واپس آؤں گا تو میرے پاس آجانا"۔

"ٹھیک ہے، انکل"۔ اب وہ پھر اُن کا بے تابی سے انتظار کرنے لگے۔

تھوڑی دیر بعد انکل آگئے اور اپنے سونے کے کمرے میں چلے گئے۔ بچے بھی وہیں پہنچ گئے۔

"تو اب میں اپنا وعدہ پورا کرتا ہوں" انکل چند لمحے خاموش رہنے کے بعد کہنے لگے "اس کہانی کا آغاز 1947ء کے زمانے سے ہوتا ہے جب پاکستان اور ہندوستان دو آزاد ملک قائم ہو گئے تھے۔ یہ تمہاری پیدائش سے کافی پہلے کی بات ہے۔ تم نے اپنی کتابوں میں پڑھا ہو گا کہ پاکستان اور ہندوستان آزاد ہوئے تو فسادات شروع ہو گئے۔ مکانوں کو آگ لگائی گئی۔ گھروں کو لوٹا گیا۔ بے گناہ لوگوں کو مارا گیا۔ بڑا ظلم ہوا"۔ انکل کہتے کہتے رک گئے۔

وجیہ بولا "انکل، ہماری کتاب میں ایک مضمون ہے 'پاکستان کی کہانی' اس میں ایسی باتیں بتائی گئی ہیں"۔

"تو آگے سنو" انکل نے سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا "امرتسر کے قریب ایک گاؤں سے مسلمانوں کے کئی خاندان بسوں اور بیل گاڑیوں میں پاکستان کی طرف روانہ ہوئے۔ ہر ایک گاڑی میں دو دو تین تین ایسے مرد بھی سوار تھے جو ہتھیاروں سے لیس تھے۔ یہ اپنے لوگوں کی حفاظت کر رہے تھے۔ ایک بیل گاڑی میں زیادہ تعداد عورتوں اور بچوں کی تھی۔ یہاں ایک مرد کے علاوہ ایک عورت بھی محافظ کا فرض ادا کر رہی تھی۔"

"عورت! وہ کیسے"؟ انیزہ جھٹ بول پڑی۔

"وہ عام عورت نہیں تھی۔ بندوق چلانا خوب جانتی تھی۔ سب سے بڑی بات یہ کہ وہ بڑی بہادر اور جرأت مند تھی۔ تو ہوا یوں کہ یہ لوگ چلے جا رہے تھے کہ دشمنوں کے ایک ٹولے نے انہیں دیکھ لیا۔ وہ اُن پر حملہ کرنے کی تیاری کر رہے تھے۔ محافظوں نے ان کے ارادے بھانپ لیے اور انہوں نے بھی اپنے ہتھیار سنبھال لئے۔ ایک دشمن یہ سوچ کر کہ ایک بیل گاڑی میں عورتیں اور بچے ہیں اور انہیں آسانی سے لوٹا اور مارا جاسکتا ہے، اس طرف بڑھنے لگا۔ محافظ عورت نے اُسے اپنی بیل گاڑی کی طرف آتے دیکھا تو للکار کر بولی:

"خبردار! جو ایک قدم بھی آگے بڑھایا۔ بھون کر رکھ دوں گی"۔

اُس کی آواز میں اتنا جوش اور اتنی قوت تھی کہ دشمن بھونچکا ہو کر رہ گیا۔ خدا کا کرنا کہ پاکستانی فوج کا ایک دستہ وہاں پہنچ گیا۔ دشمن پاکستانی فوجیوں کو دیکھ کر بھاگ گئے اور سارے لوگ صحیح سلامت لاہور پہنچ گئے۔ یہ عورت جب اپنی بیل گاڑی سے نیچے اُتری اور اُس نے پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھا تو خوشی کے مارے اُس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ اُس نے پاکستانی مٹی اُٹھا کر چومی، اپنی آنکھوں سے لگائی۔ وہ بہت خوش تھی۔

"پھر یہ ہوا کہ وقت گزرتا گیا۔ یہاں تک کہ 1965 کے ستمبر کا مہینا آگیا۔ اس مہینے میں پاکستان اور بھارت کے درمیان جنگ شُروع ہوگئی۔ اُس زمانے میں یہ بہادُر عورت ایک لمحہ بھی ضائع ہونے نہیں دیتی تھی۔ وہ گھر گھر قائدِ اعظم کا یہ پیغام پہنچاتی تھی:

"خدا کی قسم! جب تک ہمارے دشمن ہمیں اُٹھا کر بُحیرۂ عرب میں نہ پھینک دیں، ہم ہار نہ مانیں گے۔ پاکستان کی حفاظت کے لئے میں تنہا لڑوں گا۔ اُس وقت تک لڑوں گا جب تک میرے ہاتھوں میں سکت اور جسم میں خون کا ایک قطرہ بھی موجود ہے۔ اگر کوئی ایسا وقت آجائے کہ پاکستان کی حفاظت کے لئے جنگ لڑنی پڑے تو کسی صورت میں ہتھیار نہ ڈالیں اور پہاڑوں اور جنگلوں میں، میدانوں اور دریاؤں میں جنگ جاری رکھیں"۔

قائدِ اعظم کا یہ پیغام سنا کر وہ پاکستانیوں کے دل گرماتی اور ان کے سینوں میں جوش اور ولولہ پیدا کرتی رہی۔ اس نے عورتوں اور مردوں کا ایک گروپ بنا رکھا تھا۔ یہ گروپ محاذِ جنگ پر لڑنے والے پاکستانی سپاہیوں کو خوراک اور ضرورت کی چیزیں پہنچاتا تھا۔ یہ دلیر عورت ہر جگہ پہنچ جاتی اور اپنا فرض ادا کرنے میں ذرا بھی نہیں ڈرتی تھی۔ وہ جانتی ہی نہیں تھی کہ خوف کیا چیز ہوتی ہے۔

ایک رات کا ذکر ہے کہ وہ فوجیوں کے کیمپ سے واپس آرہی تھی۔ اُس نے دیکھا کہ کوئی شخص زمین پر گِرا ہوا ہے۔ اُس نے ٹارچ کی روشنی میں دیکھا کہ ایک پاکستانی فوجی سخت زخمی حالت میں بے ہوش پڑا ہے۔ اردگرد کوئی نہیں تھا۔ اُس کے ساتھی یا تو چلے گئے تھے یا کہیں اور اپنی ذمّے داری پوری کر رہے تھے۔ معاملہ بڑا نازک تھا۔ اگر وہ کسی مددگار کا انتظار کرتی تو زخمی سپاہی کی زیادہ خون بہہ جانے سے موت واقع ہو جاتی۔ اس نے اپنے بازو پھیلائے اور سپاہی کو اُٹھا لیا۔

کافی بوجھ تھا۔ مگر وہ ہمت ہارنے کے لئے تیار نہ تھی۔ وہ اُسے اٹھا کر اپنی گاڑی تک لے آئی۔ اُس کے بازو سُن ہو چکے تھے اور سانس لینے میں بڑی تکلیف محسوس کر رہی تھی۔ اب ڈرائیور نے بھی اس کی مدد کی اور زخمی سپاہی کو ہسپتال پہنچا دیا۔

پھر وہ بہادُر عورت اپنا کام اسی طرح کرنے لگی جس طرح پہلے کرتی تھی۔ وہ زخمی سپاہی کے پاس بیٹھ کر اُس کو تسلّی دیتی رہتی تھی۔ جنگ ختم ہوگئی۔ زخمی سپاہی صحت یاب ہو کر گھر جانے لگا تو اُس نے کہا "امّاں، آپ نے میرے جان بچائی ہے۔ میں آپ کا جتنا شکریہ ادا کروں، کم ہے"۔

وہ بولی "نہیں بیٹا، شکریہ ادا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں نے اپنی طرف سے وہ فرض ادا کیا ہے جو خطرے کے وقت ہر پاکستانی مرد اور عورت پر عاید ہوتا ہے۔ اللہ تمہیں پاکستان کی حفاظت کی توفیق دے ۔۔۔" یہ کہہ کر انکل خاموش ہو گئے۔

"آگے انکل؟" ساحرہ بولی۔

"آگے بیٹی یہ ہوا کہ وہ بہادُر عورت جنگ کے ختم ہونے کے پندرہ روز بعد فوت ہو گئی"۔

"فوت ہو گئی! ہائے اللہ"! انیزہ نے بڑے افسوس ناک لہجے میں کہا۔

"اور وہ سپاہی"؟ وجیہ نے پوچھا۔

"وہ سپاہی ریٹائر ہو کر امریکا چلا گیا اور اب گیارہ سال بعد واپس آیا ہے"۔

"آپ انکل"؟ سب حیرت سے بول اُٹھے۔

"ہاں بچّو! میں ہی وہ سپاہی ہوں جس کی جان اُس بہادُر عورت نے بچائی تھی"۔

بچّے حیرت سے انکل کو دیکھ رہے تھے!

لیے گاڑی کے ایک ڈبے میں سوار ہوئے۔ ہمیں پتا چلا کہ گاڑی آدھ گھنٹے بعد روانہ ہوگی۔ جب ہم گاڑی میں سوار ہو گئے تو میری چھوٹی بہن ننھی کو بھوک لگی اور اُس نے روٹی مانگی۔ بھائی نے مجھے پیسے دیے اور کہا "جاؤ روٹی لے آؤ۔" میں پیسے لے کر گاڑی کے ڈبے سے باہر آگیا۔ مجھے پتا چلا کہ روٹی اسٹیشن کے باہر ملے گی۔ میں اسٹیشن سے باہر آگیا اور روٹی لینے کے بعد جلدی جلدی گاڑی کی طرف چلنے لگا۔ جب میں گاڑی کے قریب پہنچا تو مجھے ڈبے کے اندر سے چیخوں کی آواز آئی۔ میں ڈبے کی طرف بڑھا تو ایک شخص نے میرا بازو پکڑ لیا اور کہنے لگا "اندر مت جانا۔ وہ تمہیں بھی مار ڈالیں گے۔" میں نے اُس آدمی سے کہا "آپ مجھے جانے دیں۔ ننھی کو سخت بھوک لگی ہے۔ میں اُس کے لیے روٹی لے کر آیا ہوں۔" یہ کہہ کر میں نے بازو کو تھوڑا سا جھٹکا دیا اور تیزی سے ڈبے پر چڑھ گیا۔

"ڈبے میں ہر طرف خون ہی خون تھا۔ سب سے پہلے مجھے اپنے بوڑھے باپ کا خون میں لت پت جسم نظر آیا۔ قریب ہی میری ماں پڑی تھی۔ وہ بھی اللہ کو پیاری ہو چکی تھی۔ پھر مجھے ننھی کا معصوم چہرہ دکھائی دیا۔ وہ بھی روٹی مانگ مانگ کر ہمیشہ کی نیند سو چکی تھی۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ ننھی کی روٹی نہ جانے کب میرے ہاتھ سے گر گئی تھی۔

"اچانک مجھے ایک شخص گاڑی کے ڈبے میں نظر آیا۔ میں ڈر گیا کہ کہیں یہ مجھے بھی جان سے نہ مار ڈالے۔ میں بھاگ کر ڈبے سے نیچے اُتر گیا اور بغیر سوچے سمجھے ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ بھاگنے لگا۔ ننھی کا معصوم چہرہ بار بار میری آنکھوں کے سامنے آجاتا تھا۔ میں روتا ہوا بھاگتا چلا گیا۔ تقریباً چھ سات میل کا سفر کیا ہو گا کہ شام ہونے لگی۔ میں تھک کر چور ہو چکا تھا۔ ایک جگہ کھڑا ہو کر سوچنے لگا کہ رات کیسے گزاروں گا؟ اچانک دُور ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ ایک سائیکل سوار نظر آیا۔ وہ میری طرف ہی آرہا تھا۔ جب وہ میرے نزدیک پہنچا تو میں بے اختیار زور زور سے رونے لگا۔ وہ مجھے روتے ہوئے دیکھ کر رُک گیا اور سائیکل سے اُتر کر میرے قریب آکر بولا "بیٹے تم کون ہو اور تمہیں کہاں جانا ہے؟"

"مجھے اس آدمی کے شفقت بھرے انداز سے کچھ حوصلہ ہوا۔ میں نے اُسے اپنی تمام کہانی سُنائی اور بتایا کہ اب اس دُنیا میں میرا کوئی نہیں ہے۔ ایک بڑا بھائی تھا پتا نہیں وہ بھی زندہ ہے یا نہیں۔

"میری باتیں سُن کر اُسے ترس آگیا اور وہ مجھے سائیکل پر بٹھا کر اپنے گھر لے گیا۔ وہ ایک ہندو گھرانہ تھا۔ گھر میں اُس کی بیوی اور ایک بیٹا آنند کمار بھی تھا۔ آنند کمار سکول میں پڑھتا تھا۔ میں بھی اپنے گاؤں میں پانچویں جماعت کا طالب علم تھا۔ آنند جب صُبح صُبح اسکول جاتا تو مجھے بھی اپنا سکول بہت یاد آتا۔ میرا بھی دل چاہتا کہ اسکول جاؤں۔ مگر ایسا ممکن نہ تھا۔ گھر والوں نے پہلے ہی مجھے بڑی مُشکل سے ٹھہرایا تھا۔ میرے کھانے پینے کے برتن علیحٰدہ تھے۔ اگر میرا ہاتھ اُن کے کسی برتن کو لگ جاتا تو وہ برتن اُن کو راکھ سے مانجھنا پڑتا۔ آنند کبھی میرے ساتھ کھیلنا چاہتا تو اُس کی ماں اُسے مارتی اور منع کرتی کہ آیندہ اِس کے ساتھ کبھی نہ کھیلنا۔

"میں اِس گھر میں اپنے آپ کو بہت گھٹیا محسوس کرتا تھا۔ کبھی کبھی تو مجھے اِس قدر گھٹن کا احساس ہوتا کہ سر پھٹنے لگتا۔ اب مجھے صحیح احساس ہوا کہ مسلمانوں کے لیے اپنا آزاد وطن کیوں ضروری ہے۔

ہیڈ ماسٹر صاحب نے مزید بتایا "مجھے اِس گھر میں رہتے ہوئے تقریباً چھ ماہ گزر چکے تھے۔ مجھے اپنی تعلیم کا سلسلہ ختم ہو جانے کا بے حد افسوس تھا۔ میرے ذہن میں یہ بات سما چکی تھی کہ اگر یہاں رہتا رہا تو ایک گھٹیا مزدور سے زیادہ کچھ نہیں بن سکوں گا۔ اُدھر ماں باپ اور چھوٹی بہن ننھی کی یاد بے حد ستاتی تھی۔ میں ان تمام سوچوں کا بوجھ اپنے سر پر اُٹھائے بڑی کٹھن زندگی بسر کر رہا تھا۔

پہنچتی ہے۔ ہم یہاں صرف تین لوگوں کے چشم دید واقعات لکھ رہے ہیں۔ باقی لوگوں کے بیان اِنھی سے ملتے جلتے ہیں۔

● یہ فروری 1954 کا واقعہ ہے۔ اسکاٹ لینڈ کا ایک شخص، سیڈرک النگم، صبح کو ایک پارک میں چہل قدمی کر رہا تھا کہ ایکاایکی آسمان سے چمک دار طشتری جیسی کوئی چیز اُڑتی ہوئی آئی اور اُس کے قریب زمین پر اُتر گئی۔ النگم ہکا بکا، منہ پھاڑے، کھڑا دیکھ رہا تھا کہ اُڑن طشتری کا دروازہ کھلا اور ایک شخص باہر نکلا۔ اُس کی شکل و صُورت آدمی جیسی تھی اور اس نے چمکیلا ریشمی لباس پہن رکھا تھا۔ اُس نے چند منٹ النگم سے بات چیت کی اور پھر اُڑن طشتری میں بیٹھ کر آسمان کی طرف چلا گیا۔

النگم نے اِس واقعے کے چند ماہ بعد ایک کتاب لکھی جس میں اِس حیرت انگیز واقعے کی پُوری تفصیل دی گئی تھی۔ یہ کتاب چھپتے ہی ہاتھوں ہاتھ بک گئی۔ لیکن کتاب کی اِشاعت کے چند ہی روز بعد النگم غائب ہوگیا اور آج تک پتا نہیں چلا کہ اُسے زمین کھا گئی یا آسمان نِگل گیا!

● 4 جنوری 1975 کی شام کو ارجنٹینا کی بندرگاہ باہیا بلانکا کا ایک شخص کارلو ڈائز دفتر سے گھر واپس آ رہا تھا۔ سڑک سُنسان تھی۔ صرف اِکا دُکا گاڑی کبھی کبھی فرّاٹے بھرتی گُزر جاتی۔ کارلو اپنے خیالات میں مگن چلا جا رہا تھا کہ اچانک آسمان سے روشنی کی ایک تیز شُعاع آئی اور اُس نے کارلو کو چاروں طرف سے ڈھانپ لیا۔ کارلو کو یُوں محسوس ہوا جیسے اُس پر فالج گِر گیا ہو۔ اُس نے ہاتھ پاؤں مارنے کی بُہت کوشِش کی لیکن ناکام رہا۔ چند سیکنڈ بعد اُسے معلوم ہوا جیسے وہ شعاع اُسے آہستہ آہستہ اُوپر اُٹھا رہی ہے۔

جب وہ تقریباً تین میٹر (10 فُٹ) زمین سے اُوپر اُٹھ گیا تو اُس پر بے ہوشی طاری ہونے لگی۔ اِسی نیم بے ہوشی کے عالم میں اُس نے دیکھا کہ وہ گلوب جیسے ایک کمرے میں بند ہے، اور تین شخص جن کی جِلد کا رنگ ہرا اور شکلیں آدمیوں سے مِلتی جُلتی تھیں، اُس کے سرہانے بیٹھے اُس کے سر کے بال اُکھاڑ رہے ہیں۔ مارے خوف کے وہ بے ہوش ہوگیا۔

چار گھنٹے بعد اُسے ہوش آیا تو سارا ماحول اجنبی سا لگا۔ اُس نے لوگوں سے پُوچھا تو معلوم ہوا کہ وہ باہیا بلانکا سے 800 کلومیٹر (500 میل) دُور ایک قصبے میں ہے!

کارلو کو اِغوا کرنے والے کون تھے اور اُنھوں نے اس کے سر کے بال کیوں اُکھاڑے؟ یہ باتیں ابھی تک ایک مُعمّا ہیں۔ اور سب سے بڑا مُعمّا یہ ہے کہ وہ 4 گھنٹے میں 800 کلومیٹر دُور کیسے پہنچ گیا! تیز رفتار سے تیز رفتار موٹر کار بھی اِتنے عرصے میں اِتنا فاصلہ طے نہیں کر سکتی! بہرحال، کارلو اب بھی قسمیں کھاکھا کر لوگوں کو بتاتا ہے کہ اُسے کسی دُوسری دُنیا کی مخلوق اُٹھا کر لے گئی تھی۔

● یہ واقعہ نومبر 1975ء کا ہے۔ ریاست ہائے مُتحدہ امریکا کی ایک ریاست اری زونا کا ایک شخص، ٹرے وِس والٹن، اپنے چند دوستوں کے ساتھ شہر اِسنوفلیک جا رہا تھا کہ اُسے درختوں کے ایک جُھنڈ میں تیز روشنی کا جھماکا (لشکارا) آسمان سے اُترتا دکھائی دیا۔ ٹرے وِس نے ڈرائیور کو کار روکنے کو کہا اور نیچے اُتر کر روشنی کی طرف بڑھا۔

جب وہ روشنی کے قریب پہنچا تو اُس میں سے اتنی تیز شُعاع نکلی کہ اُس کی آنکھیں چُندھیا گئیں اور وہ بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ اُس کے دوست دہشت زدہ ہوگئے اور اندھا دُھند کار بھگاتے ہوئے دُور نکل گئے۔ تھوڑی دیر بعد اُن کے ہوش ٹھکانے آئے تو وہ واپس اُس جگہ آئے جہاں ٹرے وِس بے ہوش ہو کر گرا تھا۔ لیکن وہاں اُس کا نام ونشان تک نہ تھا۔

اُنھوں نے پولیس کو یہ واقعہ سُنایا تو پولیس نے اُنھیں حوالات میں بند کر دیا۔ پولیس کا خیال تھا کہ ٹرے وِس کے دوستوں نے اُسے ہلاک کر کے کہیں دبا دیا ہے اور اپنے جُرم کو چُھپانے کے لیے یہ کہانی گھڑی ہے۔

لیکن چند روز بعد ٹرے وِس، اِسنوفلیک سے چند کلومیٹر دُور ہیبر کے مقام پر دیکھا گیا۔ اُس نے پولیس کو بتایا کہ اُسے کوئی آسمانی مخلوق اُڑن طشتری میں بٹھا کر کسی دُوسرے سیّارے میں لے گئی تھی۔

اِس کے بعد بھی مُختلف لوگوں نے، مُختلف مقامات پر، اُڑن طشتریاں دیکھیں۔ لیکن سائنس دان اِن باتوں پر یقین نہیں کرتے۔ اِس کی وجہ وُہی ہے جو پچھلے مہینے "کیوں اور کیسے" میں لکھی گئی ہے۔ (س۔ل)

پہنچ گیا۔

"میں کھڑا سوچ ہی رہا تھا کہ کس طرح پاکستان جاؤں کہ میرے کندھے پر اچانک کسی نے ہاتھ رکھ دیا۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہ کوئی جانی پہچانی شکل والا آدمی معلوم ہوا۔ اُس نے پوچھا:

"کیا تم محمد شریف کے بیٹے ہو؟"

میں نے جواب دیا "ہاں"۔

اُس نے مجھے بتایا "میں تمہارے والد کا دوست ہوں اور اُن سے ملنے اکثر تمہارے گھر آتا تھا۔ تمہارا بڑا بھائی عبدالکریم مجھے اچھی طرح جانتا ہے۔ میں تمہیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ تمہارا بھائی عبدالکریم لاہور پہنچ چکا ہے۔ ابھی ایک ہفتہ پہلے اُس کا خط آیا ہے"۔

"یہ سُن کر مجھ میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑ گئی۔ میں نے کہا "چچا آپ فوراً مجھے پاکستان بھیج دیں۔ "انہوں نے مجھے ایک آدمی کے

"اس کے بعد بھائی نے مجھے اسکول میں داخل کرا دیا۔ انھوں نے مجھے محنت مزدوری کر کے بی۔ اے کروا دیا اور آج میں تمہارے سامنے بیٹھا ہوں۔ اگر خدانخواستہ پاکستان نہ بنتا تو نہ آج میں یہاں ہوتا اور نہ آپ آزادی سے یہاں تعلیم حاصل کر رہے ہوتے"۔

ماسٹر صاحب کی اس آپ بیتی نے ہم پر جادو کی طرح اثر کیا۔ ہم تینوں اپنی اپنی جگہ پر کھڑے ہو گئے اور ہیڈ ماسٹر صاحب سے معافی طلب کی۔ میں نے کہا "سر، ہم سخت شرمندہ ہیں۔ اب ہمیں اِس پاک وطن کی قیمت کا اندازہ ہو چکا ہے۔ ہم آئندہ کبھی ایسی حرکت نہیں کریں گے۔ ہم اِس پاک وطن کے تمام شہیدوں کو سلام کرتے ہیں۔"

یہ سُن کر ماسٹر صاحب کی آنکھیں چمک اُٹھیں اور انھوں نے ہمیں معاف کر دیا۔

اس پر اس لڑکی کی ہنسی نکل گئی اور وہ بولی "مگر مس یہ تو آٹھویں جماعت کی ہے اور آپ سے ڈسٹر لینے آئی تھی۔"

"اِس!" مِس ملک نے اُچھل کر کہا "تو اس نے بتایا کیوں نہیں؟ یہ لیجئے ڈسٹر اور آئندہ ایسا نہ کیجئے۔" ہم دل ہی دل میں اُس لڑکی کو دعائیں دیتے ہوئے اپنی کلاس میں آ گئے۔

جب ہم نے نویں جماعت میں قدم رکھا تو یہ جھگڑا کھڑا ہوا کہ سائنس لیں یا آرٹ۔ ہمارے ابا حضور ہمیں ایک ڈاکٹر کے رُوپ میں دیکھنا چاہتے تھے اور امی جان ایک سُگھڑ اور سلیقہ مند لڑکی کے روپ میں۔ مگر جیت ابا جان کی ہوئی اور ہم نے سائنس لے لی۔ ایک دن کیا ہوا، ہم سائنس کی لڑکیوں نے مینڈک کی چیرپھاڑ کا پروگرام بنایا اور سائنس ٹیچر سے اجازت لیکر چپڑاسی سے ایک مینڈک منگوالیا۔ مینڈک کیا تھا پورا دیو تھا۔ ڈبے میں اِتنی زور زور سے اچھل رہا تھا کہ ہم سوچ رہے تھے کہ اسے قابو میں کیسے کریں گے۔

خیر جناب آخری پیریڈ میں ہم لیبارٹری میں پہنچے اور لیبارٹری کا دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ اب سوچنے لگے کہ مینڈک کو نکالیں کیسے؟ وہ تھا ہی اتنا خوف ناک کہ نکالنے کی ہمت ہی نہیں پڑتی تھی۔ آخر طے پایا کہ ہم ڈبا اُٹھیں گے اور راحیلہ اسے فوراً کلوروفام سُنگھا کر بے ہوش کر دے گی۔ بس جناب جوں ہی ہم نے ڈبا اُٹھا مینڈک صاحب لمبی جست لگا کر سامنے کھڑی راحیلہ کے اُوپر۔ راحیلہ چیخ مار کر پیچھے ہٹی اس کے چیخ مارتے ہی ہم سب نے بھی چیخنا شروع کر دیا۔ اب حالت یہ تھی کہ مینڈک اِدھر اُدھر پُھدک رہا تھا اور ہم پکڑو پکڑو کا شور مچاتے ہوئے اس کے پیچھے دوڑ رہے تھے۔ شور اتنا تھا کہ کسی نے ٹیچر کی آواز نہ سُنی جو دروازہ کھٹکھٹا رہی تھیں۔ آخر ایک لڑکی نے دروازہ کھولا، ٹیچر اندر آئیں اور گرج کر بولیں "یہ کیا ہو رہا ہے؟" ابھی انہوں نے اتنا ہی کہا تھا کہ مینڈک صاحب جو باہر جانے کے لیے راستہ تلاش کر رہے تھے ہائی جمپ لگا کر ٹیچر کے پاؤں کو چھوتے ہوئے باہر بھاگے۔ ٹیچر "اُوئی اللہ!" کہہ کر میز کے اوپر چڑھ گئیں۔ پھر کیا ہوا؟ چھوڑیے اسے راز ہی رہنے دیجیے۔

ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ کلاس میں کچھ لڑکیاں پسند ہوتی ہیں اور کچھ اتنی ناپسند کہ ایک منٹ ان سے نہیں بنتی۔ ہماری کلاس میں بھی ایک لڑکی تھی شہلا۔ شاید ہی کوئی ایسا خوش قسمت دن گزرا ہو جب ہم دونوں میں جنگ نہ چھڑی ہو۔ جب بھی ہم ایک دوسرے کے پاس سے گزرتے کوئی نہ کوئی فقرہ ضرور کس دیتے۔ ایک دن ہماری کلاس میں ایک نئی لڑکی داخل ہوئی۔ شہلا نے فوراً اسے اپنے گروپ میں شامل کر لیا۔ ہم کب یہ برداشت کر سکتے تھے سوچا کہ ہم بھی اس سے دوستی کریں گے۔ آدھی چُھٹی ہوئی تو ہم نے دیکھا کہ وہ لڑکی اور شہلا کھڑے باتیں کر رہے ہیں۔ ہم فوراً وہاں پہنچے اور بولے "آپ کی تعریف؟"

"جی، مجھے نازش کہتے ہیں۔"

"بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر" یہ کہتے ہوئے ہم نے دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔

"مگر مجھے بڑی کوفت ہوئی" نازش کے بجائے شہلا نے جواب دیا اور شرارت سے اپنی کہنی ہمارے ہاتھ کی طرف بڑھا دی۔ اس پر پاس کھڑی لڑکیوں نے ایک زبردست قہقہہ لگایا اور ہم نے وہاں سے کھسکنا ہی مناسب سمجھا۔

ایک دن ہم سب لڑکیاں بیٹھے باتیں کر رہی تھیں کہ شہلا بولی "کنول، کل میں نے تمہیں کہیں دیکھا تھا۔" ہم نے پوچھا "کہاں؟" بولی "جہنّم کے ساتویں درجے میں۔" ہم فوراً بولے "مگر تم وہاں کیا کر رہی تھیں؟" یہ سن کر سب لڑکیوں کی ہنسی نکل گئی اور شہلا شرمندہ ہو کر چپ ہو گئی۔ ہمارے گروپ نے شہلا کا نام مچھر رکھا ہوا تھا کیونکہ وہ بہت دُبلی پتلی تھی۔ جہاں سے گزرتی ہم فوراً مچھر مچھر

نیل کنول

شاید ہی کوئی ایسا انسان ہو جس نے غمر کے کسی حصے میں اپنے ماضی یعنی گزرے ہوئے زمانے کو پکارا نہ ہو۔ ماضی کا مطالعہ کرتے ہوئے ہمیں اس کا اقرار کرنا پڑتا ہے کہ انسان خطا کا پُتلا ہے۔ ایسی ہی ایک خطا وہ اپنے ماضی کو ٹٹولتے وقت کرتا ہے۔ جب وہ اپنے ماضی کی تصویر کا صرف ایک رخ دکھا کر اس کی بُرائیوں کو اچھائیوں سے کچلنا چاہتا ہے اور خود بہ خود اس خوش فہمی کا شکار ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے دامن میں خوبیوں اور اچھائیوں کی وسیع دنیا پوشیدہ رکھتا ہے۔ وہ جتنے جوش و خروش سے اپنی اچھائیوں کو ظاہر کرتا ہے، اتنی ہی بے رحمی سے بُرائیوں کو کچلتا یا چھپاتا ہے۔

آج اپنے ماضی کی یہ رنگین فلم دکھاتے وقت میں نے یہی کوشش کی ہے کہ تصویر کے دونوں رُخ آپ کو دکھاؤں۔ اگر میں نے اپنی کہانی بچپن سے شروع کی تو شاید آپ اکتا جائیں۔ مگر اتنا ضرور بتادوں کہ پیدا ہوتے ہی ہم نے شیطان کی شاگردی اختیار کر لی تھی۔ ذرا بڑے ہوئے تو اماں باوا نے کان مروڑ کر اسکول دکھایا۔ مگر ہمارے استاد شیطان نے خبردار کیا کہ کدھر جاتے ہو؟ پھر شاید ہی کوئی دن ایسا گزرتا ہو جس دن صبح کو ہمارے پیٹ، سر یا ٹانگ میں درد نہ ہوتا ہو۔ مگر جب ابا جان مولا بخش کی صورت اختیار کر لیں تو کون کافر اسکول کا رخ نہ کرتا۔ ہم بیٹھے جماعت کے کمرے میں ہوتے مگر کان گھنٹی کی طرف ہوتے۔ خصوصاً مس ملک کے پیریڈ میں وہ کلاس میں آتیں، رجسٹر میز پر رکھتیں اور کہتیں:

"بچو! گھنٹی بجے تو مجھے بتا دینا۔"

یہ کہہ کر کرسی پر نیم دراز ہو جاتیں۔ پھر اکثر ایسا ہوتا کہ کوئی لڑکی شرارت سے اٹھ کر کہہ دیتی "مس! گھنٹی بج گئی۔" اور مس ملک اپنا رجسٹر بغل میں دبا کر کلاس سے نکل جاتیں۔ بعد میں جب ان کو پتا چلتا کہ ابھی گھنٹی نہیں بجی تو ہماری شامت آجاتی۔ اور تو اور اُن کی یہ حالت تھی کہ انہیں پتا ہی نہیں تھا کہ اُن کی کلاس میں کون کون بچہ پڑھتا ہے۔ حتیٰ کہ انہیں ہمارے نام تک یاد نہ تھے۔ اُن کی اسی لاپروائی نے ہمیں ایک دفعہ پھنسوا دیا۔ ہوا یوں کہ ہمارا حساب کا پیریڈ تھا۔ حساب کی ٹیچر نے ہم سے کہا کہ ساتھ والی جماعت سے ڈسٹر لے آؤ۔ بد قسمتی سے ساتھ والی جماعت میں مس ملک کا پیریڈ تھا۔ جب ہم اس کمرے میں داخل ہوئے تو اس سے پہلے کہ ہم کچھ بولتے مس ملک بول اُٹھیں "آپ کہاں غائب تھیں؟ آپ کو پتا نہیں پیریڈ شروع ہو چکا ہے؟ چلیے اُدھر کونے میں منہ کر کے کھڑی ہو جائیے۔"

ہم نے لاکھ بتانے کی کوشش کی کہ ہم دوسرے کمرے سے کام کے لیے آئے ہیں، لیکن مس نے ایک نہ سُنی۔ مجبوراً کونے میں کھڑا ہونا پڑا۔ جب کافی دیر ہو گئی تو حساب کی مس نے ہماری تلاش میں ایک لڑکی کو بھیجا وہ لڑکی مس ملک کے کمرے میں داخل ہوئی تو ہمیں کونے میں کھڑا دیکھ کر بہت حیران ہوئی۔ اس نے مس سے پوچھا کہ آپ نے کنول کو سزا کیوں دی ہے؟

مس ملک نے جو اس وقت اونگھ رہی تھیں، حیرت سے پوچھا "کون کنول؟"

اس لڑکی نے کہا "وہ جو کونے میں کھڑی ہے۔"

مس نے مڑ کر ہماری طرف دیکھا اور بولیں "اس لیے کہ یہ دیر سے آئی تھی۔"

ننھا موسیٰ نیل کی موجوں پر

ڈاکٹر عبدالرؤف

حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش سے تقریباً چودہ سو سال پہلے کی بات ہے کہ مصر میں ایک طاقتور فرعون حکومت کرتا تھا۔ اُن دنوں مصر کے تمام بادشاہوں کو فرعون کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔ اُس وقت کے فرعون کا نام رامسس دوم تھا۔ رامسس بے حد مغرور اور ظالم فرماں روا تھا۔ قبیلہ بنی اسرائیل کے لوگ جو مصر میں آباد ہو چکے تھے، وہ انہیں بہت تنگ کیا کرتا تھا۔ شاہی نجومیوں نے پیش گوئی کر رکھی تھی کہ ایک روز بنی اسرائیل کے ایک گھرانے میں ایک لڑکا پیدا ہو گا جو انجام کار فرعون کا تختہ اُلٹ دے گا۔ اس پر ظالم فرعون نے طیش میں آکر حکم دے دیا کہ آئندہ بنی اسرائیل کے تمام نوزائیدہ بچے پیدا ہوتے ہی ہلاک کر دئیے جایا کریں۔

اِتفاق سے اُنھی دنوں قبیلہ بنی اسرائیل کے ایک نیک گھرانے میں ایک بچّہ پیدا ہوا جس کا نام موسیٰ رکھا گیا۔ ظالم فرعون کے سپاہیوں کے خوف سے، بیچاری ماں نے مسلسل تین ماہ تک بچّے کی پیدائش کے معاملے کو چھپائے رکھا۔ مگر پریشان حال ماں کو یہ خدشہ ہر دم ستائے جا رہا تھا کہ کہیں موسیٰ کی پیدائش کی خبر فرعون کے افسروں تک نہ جا پہنچے۔ جُوں جُوں دن گذرتے گئے تُوں تُوں ماں کا اِضطراب بڑھتا ہی چلا گیا۔ وہ بیچاری کسی صورت بھی سفاک فرعون کے ہاتھوں اپنے پیارے بچّے کے قتل پر تیار نہ تھی۔ آخر اس نے فرعون کے چنگل سے بچّے کو محفوظ رکھنے کے لئے ایک انوکھا منصوبہ تیار کیا۔ اُس نے ننّھے موسیٰ کو لکڑی کے ایک صندوقچے میں لٹا کر اُسے دریائے نیل میں پانی کی سطح پر تیرتا ہوا چھوڑ دیا۔

فرعون نے اپنے محل کے باغات کی آبپاشی کے لئے دریائے نیل سے ایک نہر کُھدوائی ہوئی تھی۔ جب لکڑی کا صندوقچہ اپنے ننّھے مسافر کو لیے اُس مقام پر پہنچا تو پانی کے بہاؤ کے ساتھ نہر کی جانب مُڑ کر تَیرنے لگا۔ پھر نہر کے پانی کی سطح پر بہتے بہتے یہ صندوقچہ اور اس کا معصوم مسافر شاہی باغ میں پہنچ گیا۔ اتّفاق سے فرعون کی ملکہ آسیہ کی نگاہ صندوقچے پر پڑ گئی۔ ایک پیارے سے بچّے کو صندوقچے میں یوں مزے سے لیٹے دیکھ کر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ نیک دل ملکہ بے اولاد تھی۔ انسانی ہمدردی اور شفقتِ مادری کے جذبوں سے مجبور ہو کر اس نے بچّے کو گود میں اٹھا لیا۔ معصوم بچّے کی شکل و صورت ہی کچھ ایسی پُروقار تھی کہ ملکہ نے اُسے اپنا بیٹا بنانے کا ارادہ کر لیا۔ اُس نے فرعون کو بھی بڑی مشکل سے اِس بات پر راضی کر لیا۔

چنانچہ ننّھے موسیٰ پر شاہی محل کی ٹھاٹھ دار زندگی کے دروازے کھول دیے گئے۔

(مسلسل)

انگوٹھی کہاں گئی؟ قسط 3

کھوپڑی پر موم بتی روشن تھی

اے حمید

سندھ فتح کرنے کے بعد محمد بن قاسم کی فوجیں ملتان کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ ہمارا ہیرو فاران بھی لشکرِ اسلام کے ساتھ تھا۔ جیسا کہ آپ پہلی قسط میں پڑھ چکے ہیں فاران محمد بن قاسم کی فوج کے ایک سالار عقبہ کے ملازمِ خاص کی حیثیت سے یہ تاریخی سفر کر رہا تھا۔ فاران اپنے کالج کے دوستوں کے ساتھ محمد بن قاسم کی تلوار کو دیکھنے سندھ کے ایک پُرانے قلعے میں آیا تھا کہ وہاں وہ قلعے کے ایک تہہ خانے میں پھنس گیا۔ اس کی ملاقات سیاہ پوش آقا زوناش سے ہو گئی جس نے فاران کو بتایا کہ اب وہ قدیم تاریخ کے زمانے میں داخل ہو چُکا ہے اور اس کا واپس اپنے زمانے یعنی 1989ء کے زمانے میں پہنچنا مشکل ہے۔ زوناش نے کہا تھا۔

"فاران! اب تم بِرصغیر ہندوستان میں اسلامی تاریخ کے ساتھ ساتھ سفر کرو گے۔ یوں تم مشہور تاریخی واقعات کو بھی اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھو گے اور مشہور مسلمان بادشاہوں، جرنیلوں، سپہ سالاروں اور مجاہدوں سے بھی ملو گے۔ جب تاریخی واقعات کا سلسلہ قائدِ اعظم کے زمانے تک پہنچ جائے گا اور پاکستان بن جائے گا تو تم خود بخود اپنے گھر والوں اور دوستوں کے پاس پہنچ جاؤ گے۔ تم سینکڑوں برس کا سفر کر کے 1989 کے لاہور میں پہنچو گے مگر تم پر عمر کا کوئی اثر نہیں ہو گا اور جب سینکڑوں برس کا سفر کر کے تم لاہور اپنے دوستوں اور گھر والوں کے پاس پہنچو گے تو تمہیں محسوس ہو گا کہ تمہیں ان سے جُدا ہوئے صرف آدھ گھنٹہ ہوا ہے۔"

فاران نے کہا تھا کہ "بابا جان! اگر میں پاکستان بننے کے زمانے سے پہلے اپنے عہد میں اپنے گھر والوں کے پاس نہیں پہنچ سکتا تو ٹھیک ہے۔ میں تاریخ کا یہ سفر بڑے شوق اور دلچسپی سے طے کروں گا اور مسلمان بادشاہوں اور بہادر سپہ سالاروں کو اپنی آنکھوں سے دیکھوں گا۔ مگر بابا جان! یہ بڑا خطرناک سفر ہے اور میں اکیلا ہوں۔ چاروں طرف خطرے ہی خطرے ہوں گے۔ اگر میرے اندر کوئی طاقت پیدا کر دی جاتی تو میں اس سفر کے خطرات کا مقابلہ کر سکتا تھا۔ اس پر آقا زوناش نے کہا تھا۔

"فاران! اس کے لئے تمہیں یہاں سے مُلک بغداد جا کر بزرگ ابو ہاشم سے ملنا ہو گا۔ انہیں تمہارے بارے میں پہلے سے بتا دیا گیا ہے۔ ابو ہاشم دریائے دجلہ کے کنارے ایک خانقاہ میں رہتے ہیں۔ وہ تمہیں ایک خُفیہ طاقت دیں گے جو تمہارے کام آئے گی۔ اس کے بعد آقا زوناش غائب ہو گئے تھے۔ پھر فاران بھی محمد بن قاسم کی فوج میں شامل ہو گیا۔ وہ اسلامی لشکر کے ایک سالار عقبہ کا ملازمِ خاص بن گیا۔ مسلمانوں نے سندھ فتح کر کے وہاں کے ہندو راجہ کو شکست دی۔ ہندو راجہ داہر لڑائی میں مارا گیا سندھ پر اسلامی پرچم لہرانے لگا۔ اس کے بعد محمد بن قاسم ملتان کی طرف چلا۔ کیونکہ ملتان میں ایک ہندو راجہ کی حکومت تھی جو رعایا پر بڑا ظلم کرتا تھا اور بُتوں کی پوجا کرتا تھا۔ محمد بن قاسم ملتان پر بھی اسلامی پرچم لہرانا اور بُتوں کو پاش پاش کر دینا چاہتا تھا۔

پکارنا شروع کر دیتے ایک دن ہمارے اسکول میں افطار پارٹی تھی۔ ہم نے اپنا سب سے اچھا سینٹ لگایا۔ جب اسکول گئے تو سب لڑکیوں نے اس کی خوشبو کی تعریف کی جسے شہلا برداشت نہ کر سکی۔ ہمارے پاس سے گزری تو رومال ناک پر رکھ کر بولی "یہ تم نے اپنے کپڑوں پر ڈی۔ ڈی۔ ٹی کیوں چھڑکی ہے؟" ہم نے فوراً جواب دیا "کیونکہ ہمارے آس پاس مچھر بہت ہیں۔"

ان لڑکیوں کے علاوہ جن سے ہماری ان بن رہتی تھی، کچھ ایسی بھی تھیں جو ہمیں بے حد عزیز تھیں۔ ان میں غزالہ، فائزہ، جلال اور مریم کے نام سرِفہرست ہیں۔ غزالہ کو ہم ڈاکٹر کہتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ کسی کو ذراسی بھی تکلیف ہو تو مِس غزالہ فوراً اُس تکلیف کا نام بتا دیتی تھیں۔ ایک دن کیا ہوا کہ ہمیں سخت زکام تھا۔ اسکول گئے تو آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ غزالہ نے پوچھا۔

"کنول؟ تمہاری آنکھیں سُرخ کیوں ہو رہی ہیں؟"

"زکام ہے" ہم نے کہا۔

گھبرا کر پوچھنے لگی "کیا سر میں بھی درد ہو رہا ہے؟

"ہاں، ہو تو رہا ہے" ہم نے جواب دیا۔

"اور پیاس بھی لگتی ہے؟" اُس نے پوچھا۔

"ہاں، لگتی تو ہے مگر پانی پینے کو جی نہیں چاہتا کیوں کہ حلق کڑوا ہو گیا ہے۔"

"ہائے کنول!" وہ سر پیٹ کر بولی "یہ زکام نہیں۔ تمہیں ہائی ڈرو فوبیا ہو گیا ہے!"

کیا ہو گیا ہے؟" ہم نے حیرت سے پوچھا۔

"ہائے! تمہیں یہ بھی نہیں پتا؟" وہ بزرگانہ انداز میں بولی "ارے پگلی، یہ تو بہت خطرناک۔ بیماری ہے۔ جس کی آنکھیں سرخ ہوں، سر میں درد ہو اور پانی سے ڈرتا ہو تو سمجھ لو اس کو ہائی ڈرو فوبیا ہو گیا ہے۔ اس۔ بیماری میں پہلے انسان اندھا ہو جاتا ہے، پھر اس پر دورہ پڑتا ہے اور پھر بس۔۔۔"

"اور پھر بس کیا؟" ہم نے خوف زدہ ہو کر پُوچھا۔

"ارے بابا! پھر وہ مر جاتا ہے" وہ بولی۔

یہ سُننا تھا کہ ہمارے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ بھاگم بھاگ گھر پہنچے اور جاتے ہی امی کو بتایا کہ ہمیں ہائی ڈرو فوبیا ہو گیا ہے۔ امی بولیں "اے نوج! کیا بکے جا رہی ہے؟"

"سچ کہہ رہی ہوں، امی" ہم نے آنکھیں پھاڑ کر کہا "یہ بہت خطرناک۔ بیماری ہے۔ پہلے انسان اندھا ہوتا ہے پھر مر جاتا ہے پھر اس پر دورہ پڑتا ہے۔ اوہو! میرا مطلب ہے، پہلے دورہ پڑتا ہے، پھر مر جاتا ہے۔ ہائے امی! اب امتحان کیسے دُوں گی۔" یہ کہہ کر ہم رونے لگے۔ مگر دل میں خوش ہو رہے تھے کہ چلو، اگر مر گئے تو امتحان سے چھٹکارا ملے گا۔ امی بے چاری سیدھی سادی یُن کر گھبرا گئیں۔ فوراً اباجان کو فون کیا۔ اباجان گھبرائے ہوئے گھر آئے اور پوچھا "کیا ہوا؟" ہم نے روتے روتے بتایا کہ ہمیں ہائی ڈرو فوبیا ہو گیا ہے۔

"کیا ہو گیا ہے؟" ابا نے حیرت سے پوچھا۔

"جی، ہائی ڈرو فوبیا ہو گیا ہے" ہم نے جواب دیا "غزالہ کہہ رہی تھی کہ یہ بہت خطرناک۔ بیماری ہے۔ ہائے ابو اب ہم مر جائیں گے نا؟" یہ کہہ کر ہم رونے لگے۔

ابُو نے گھبرا کر پوچھا "بیٹے وہ کُتا کیسا تھا جس نے تم کو کاٹا تھا؟"

ہم نے کہا "جی، کتے نے تو نہیں کاٹا۔"

"تو پھر تم کو ہائی ڈرو فوبیا کیسے ہو گیا؟" ابو نے جھنجھلا کر کہا۔

ہم نے کہا "جی، وہ ہماری آنکھیں سرخ ہیں اور سر میں درد بھی تھا۔ غزالہ نے بتایا کہ جس کو یہ تکلیف ہو اسے ہائی ڈرو فوبیا ہو جاتا ہے۔"

یہ سننا تھا کہ ابو نے زبردست قہقہ لگایا اور بولے "تم اور غزالہ دنیا کی سب سے بڑی بے وقوف لڑکیاں ہو۔ ہائی ڈرو فوبیا تو وہ۔ بیماری ہے جو پاگل کتے کے کاٹنے سے ہوتی ہے۔ تم کو تو صرف زکام ہے۔"

یہ سُن کر سب ہنسنے لگے اور ہماری جان میں جان آئی۔ ہم نے فوراً غزالہ کو فون کیا اور سارا واقعہ بتایا۔ پھر پوچھا کہ تم نے مجھے غلط کیوں بتایا تھا تو وہ بولی "سوری کنول۔ جب میں گھر آئی تو مجھے یاد آیا کہ میں نے تم کو غلط بتا دیا تھا۔ اصل میں تمہاری۔ بیماری کا نام۔۔۔۔"

"خُدا کے لیے چُپ کرو۔" ہم نے اس کی بات کاٹ کر کہا "مجھے نہیں سننا کسی۔ بیماری کا نام۔ اور ہاں، ایک بالکل مُفت مشورہ دے رہی ہوں کہ ڈاکٹر بننے کا خیال چھوڑ دو ورنہ تمہارے ڈاکٹر بنتے ہی قبر کھودنے والوں کی چاندی ہو جائے گی اور ہر قبرستان کے باہر یہ بورڈ لگا ہو گا۔

ہاؤس فُل!

تعاون کے لیے ہم ڈاکٹر غزالہ کے شُکر گزار ہیں۔

اسلامی لشکر صحراؤں اور میدانوں اور گھاٹیوں میں سفر کرتا ہوا ملتان شہر کے باہر ایک کھلے میدان میں آگیا یہاں اسلامی لشکر نے خیمے لگالئے۔ اسلامی لشکر اتنا بڑا تھا کہ وہاں خیموں کا ایک شہر نظر آنے لگا۔ فاران بھی سالار عقبہ کے خیمے میں تھا۔ محمد بن قاسم نے فوراً ایک اجلاس بُلایا اور جاسوسوں کو شہر کے حالات معلوم کرنے کے واسطے بھیجا۔ ملتان کے ہندو راجہ نے مسلمانوں کے لشکر کو آگے بڑھتے دیکھ کر قلعے کے دروازے بند کر لئے تھے۔ قلعے کے اوپر ہندو فوجی تیر کمان اور کھولتے ہوئے تیل کے کڑاؤ لے کر بیٹھ گئے تھے۔

جاسوس کسی نہ کسی طرح مُلتان شہر میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ انہوں نے واپس آکر محمد بن قاسم کو اور دوسرے مسلمان فوجی افسروں کو بتایا کہ ملتان کی فصیل اور قلعہ بہت مضبوط ہے اور راجہ کے پاس کافی فوج بھی ہے۔ محمد بن قاسم نے کہا۔

"ہم انشاء اللہ فتح حاصل کریں گے۔ کیونکہ ہم حق پر ہیں اور ہم سچائی اور امن کا پیغام لے کر آئے ہیں۔ ہم یہاں کی رعایا کو راجہ کے ظلم و ستم سے نجات اور بُت پرستی کا خاتمہ کرنے اور اللہ کا نام بُلند کرنے کے لئے آئے ہیں۔ فتح ہماری ہی ہوگی۔"

"انشاء اللہ" سب فوجی افسروں نے ایک زبان ہو کر کہا۔ قلعے پر پتھر اور آگ کے گولے برسانے والی مُنجنیقیں شہر کے بند دروازے اور قلعے کی دیواروں کے سامنے لاکر کھڑی کر دی گئیں۔ اسلامی لشکر نے دن نکلتے ہی کفار پر حملہ کرنے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ سورج ایک پہر بلند ہوا تھا کہ اسلامی لشکر میں اللہ اکبر کا نعرہ بُلند ہوا اور منجنیقوں نے شہر کی فصیل اور دروازے پر پتھر

برسانے شروع کر دیئے۔ شہر کی فصیل میں جگہ جگہ شگاف پڑ گئے۔ دروازہ ٹوٹ گیا اور لشکرِ اسلام نعرۂ تکبیر کی گونج کے ساتھ شہر میں داخل ہوگیا۔ گھمسان کی جنگ شروع ہوگئی۔ مگر بُزدل ہندو مسلمان مجاہدوں کے حملوں کی تاب نہ لاسکے اور بھاگ کھڑے ہوئے۔ راجہ اپنے سپہ سالار سمیت لڑائی میں مارا گیا اور ملتان شہر پر اسلام کا

پرچم لہرا دیا گیا۔ محمد بن قاسم نے یہاں بھی ایک بہادر مسلمان جرنیل کی طرح غیر مُسلم قیدیوں کے ساتھ اچھا سلوک کیا۔ انہیں رہا کر دیا گیا۔ مسلمان مجاہدوں نے کسی بچّے، بوڑھے مرد اور عورت پر ہاتھ نہ اُٹھایا نہ کسی درخت کو اکھاڑا نہ کسی کھیت میں آگ لگائی۔ ہندو، مسلمانوں کے اس سلوک سے اتنے متاثر ہوئے کہ سینکڑوں نے بتوں کی پوجا سے توبہ کر لی اور وہیں اسلام قبول کر لیا۔ محمد بن قاسم کے حکم سے ملتان میں مسجد کی تعمیر کا کام شروع کر دیا گیا۔ شہر میں امن و امان قائم ہوگیا۔ ملتان کو فتح کرنے کے بعد محمد بن قاسم نے اپنے سالار کو وہاں کا گورنر بنا کر چھوڑا اور خود واپس سندھ روانہ ہوگیا۔

فاران ابھی تک ملتان میں ہی تھا۔ ایک روز وہ شام کے وقت ملتان کے بازاروں کی سیر کرتا شہر کے دروازے میں سے نکل کر ریت کے ٹیلوں کی طرف چلا گیا۔ سورج غروب ہو چُکا تھا۔ ریت ٹھنڈی ہو گئی تھی جس کی وجہ سے بڑی خوشگوار ہوا چل رہی تھی۔ فاران کو یہ موسم اتنا اچھا لگا کہ وہ مزے سے پھرتا پھراتا ریت کے ٹیلوں کی طرف آگیا۔ اب ہلکا ہلکا اندھیرا چھانے لگا تھا۔ آسمان پر اک دُکا تارے بھی نکل آئے تھے۔ فاران کو ان ٹیلوں کی طرف نہیں آ چاہیے تھا۔ ریت کے ٹیلے صحرا میں ایک طرح کی بھول بھلیا

سرزنش

محمد اقبال ثاقب

ابھی دوسرا پیریڈ شروع ہی ہوا تھا کہ کلاس روم کے دروازے پر ہمارے اسکول کا چپڑاسی بابا اللہ بخش نمودار ہوا۔ ماسٹر صاحب نے اُسے اندر آنے کے لیے کہا تو بابا اللہ بخش نے آگے بڑھ کر ایک کاغذ ماسٹر صاحب کے ہاتھ میں تھما دیا۔ ماسٹر صاحب نے کاغذ پڑھا اور میرا نام پُکار کر کہا "ناصر! کھڑے ہو جاؤ۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے تمھیں اپنے دفتر میں بُلایا ہے"۔

یہ سُن کر میرا چہرہ اُتر گیا اور میں بابا اللہ بخش کے پیچھے پیچھے ہیڈ ماسٹر صاحب کے دفتر کی طرف چل دیا۔ میرا دل خوف سے دھک دھک کر رہا تھا۔ کیونکہ کل کے واقعہ میں انور اور مسعود کے ساتھ میں بھی پیش پیش تھا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے ہیڈ ماسٹر صاحب سے اجازت لی اور دفتر میں داخل ہو گیا۔ دفتر میں انور اور مسعود پہلے ہی سے موجود تھے۔

ہیڈ ماسٹر صاحب ہمارے بہت ہی شفیق اُستاد تھے لیکن آج اُن کے چہرے پر برہمی کے آثار تھے۔ ہم بڑی خاموشی سے ہیڈ ماسٹر صاحب کے سامنے شرمندہ شرمندہ بیٹھے تھے۔ وہ عینک اُتار کر ہم سے مخاطب ہوئے اور کہنے لگے۔

"بیٹے! آپ کی کل والی حرکت کا مُجھے جب پتا چلا تو بے حد افسوس ہوا۔ مجھے ہرگز یہ توقع نہ تھی کہ میرے اسکول کے بچّے نادانوں ایسی حرکت کریں گے۔"

ہیڈ ماسٹر صاحب کی یہ باتیں سُن کر میں زمین میں دھنسا جا رہا تھا۔ انور اور مسعود کے جذبات بھی کچھ ایسے ہی تھے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے جو باتیں کیں اُنھوں نے ہمارا دِل ہلا کے رکھ دیا۔ وہ کہنے لگے۔

"آپ نے گورنمنٹ ٹرانسپورٹ کی جِس بس کو توڑ پھوڑ کا نشانہ بنایا دراصل وہ ہماری اپنی بس تھی اور ہمارے اس پاک وطن کا حصّہ تھی۔ شاید آپ نہیں جانتے کہ ہم نے اس وطن کی ایک ایک چیز کے لیے خُون کی بھاری قیمت ادا کی ہے۔ لیکن آپ کو اس کا احساس نہیں کیونکہ آپ نے یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا۔ میں نے اس مُلک کے لیے اپنی ماں، بہن اور باپ کو اپنی آنکھوں کے سامنے قُربان ہوتے دیکھا ہے"۔

ہیڈ ماسٹر صاحب نے جب یہ جُملے ادا کیے تو اُن کی آنکھیں چھلک اُٹھیں ہم تینوں مَر کر مٹّی ہو رہے تھے کہ کاش! ہم یہ حرکت نہ کرتے اور ہمارے انتہائی شفیق اُستاد کا دِل نہ دُکھتا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب آب دیدہ ہو کر کہنے لگے۔

"1947ء میں میری عمر کوئی نو دس برس ہوگی۔ ہم تمام گھر والے پاکستان بننے کی خُوشی میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اپنے گاؤں سے جودھ پور اسٹیشن پُہنچ گئے۔ میں اپنے امّی، ابّو، چھوٹی بہن اور بڑے بھائی کے ساتھ تھا۔ میرے بڑے بھائی کا نام عبد الکریم تھا اور وہ مُجھ سے تقریباً 4 سال بڑے تھے۔ ہم سب لاہور آنے کے

بلند آواز میں کہا۔ "وہ لیٹر نے درختوں کی طرف گیا ہو گا چلو اسے یوں چل کر دیکھتے ہیں۔" اس کے بعد گھوڑوں کے ٹاپوں کی دھمک وہاں سے دُور چلی گئی۔ جب اوپر خاموشی چھا گئی تو فاران نے سوچا کہ معلوم کرنا چاہیے کہ وہ کہاں آ گیا ہے۔ اندھیرا اتنا گہرا تھا کہ فاران کو اپنا ہاتھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے اپنے دونوں بازو پھیلا دیئے۔ اس کا بایاں ہاتھ ایک دیوار سے ٹکرایا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے دیوار کو ٹٹولا۔ دیوار بُھربُھری تھی۔ فاران نے اوپر کی طرف دیکھا۔ اس کا خیال تھا کہ جہاں سے وہ نیچے گرا ہے وہیں سے باہر نکلنے کی کوشش کرے گا۔ مگر حیرانی کی بات یہ تھی کہ اسے اوپر شگاف میں سے آسمان نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ شگاف اس کے گرتے ہی بند ہو گیا ہو۔ فاران کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس اندھیرے غار سے کیسے باہر نکلے۔ وہ بُھربُھری دیوار کو کُھرچنے لگا کہ شاید اس طرح وہاں سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ پیدا ہو جائے۔

دیوار کے اوپر جو ریت خستہ ہو رہی تھی وہ صاف ہوئی تو نیچے سے پتھر نکل آئے۔ دیوار اب کُھرچی نہیں جا سکتی تھی۔ فاران دیوار کو ہاتھوں سے ٹٹول ٹٹول کر آگے بڑھنے لگا۔ غار تنگ تھا۔ کہیں کہیں اس میں جالے بھی لٹک رہے تھے۔ فاران جالوں کو ہٹاتا قدم قدم آگے بڑھ رہا تھا۔ غار بائیں جانب مڑ گیا۔ فاران کو غار میں ہلکی سی روشنی نظر آنے لگی۔ یہ روشنی غار کے آخر میں دکھائی دے رہی تھی۔ فاران حیران ہوا کہ زمین کے اندر یہاں کس نے دیا جلا رکھا ہے۔ فاران آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا روشنی کے قریب آیا تو اس کا اوپر کا سانس اوپر ہی رہ گیا۔ کیا دیکھتا ہے کہ پتھر کی ایک سِل کے اوپر ایک انسانی کھوپڑی پڑی ہے۔ اور کھوپڑی کے اوپر ایک چراغ جل رہا ہے۔ فاران ایک طرف چُپ چاپ بُت کی طرح کھڑا اس ڈراونی کھوپڑی کو دیکھتا رہا۔ اس کے دماغ میں طرح طرح کے خیال آ رہے تھے۔ یہ کھوپڑی یہاں کس نے رکھی ہے؟ اس پر کس نے چراغ جلایا ہے؟ یہ کس کی کھوپڑی ہے؟ ضرور یہ کوئی طلسم اور جادوگری کا کام ہو گا۔ فاران سوچنے لگا۔ یہاں آگر غار بند ہو جاتا تھا۔ فاران نے فیصلہ کیا کہ اسے یہاں سے واپس چلے جانا چاہیے۔ کہیں کسی نئی مصیبت میں نہ پھنس جائے۔ وہ واپس مڑا ہی تھا کہ اسے ایک لڑکی کی آواز آئی۔

"یہاں تک آ گئے ہو تو واپس نہ جاؤ۔"

فاران ایک دم ٹھٹھک سا گیا۔ اس کو خوف کے مارے جسم میں خون سرد ہوتا محسوس ہوا۔ یہ کس کی آواز تھی؟ کوئی لڑکی اسے وہاں نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ خوف زدہ ہو کر وہیں رُک گیا۔ پھر وہاں سے بھاگنے کا فیصلہ کر کے قدم اٹھانے کی کوشش کی تو اس کے پاؤں نے اٹھنے سے انکار کر دیا۔ زمین نے اس کے دونوں پاؤں کو جکڑ لیا تھا۔ پہلے تو فاران نے اسے اپنا وہم سمجھا۔ مگر جب اس نے پورا زور لگایا اور پاؤں زمین سے بالکل نہ ہلے تو وہ سمجھ گیا کہ کھوپڑی نے اس پر جادو کر دیا ہے۔ اس وقت اسی لڑکی کی آواز پھر آئی۔

"فاران! میں جانتی ہوں تم کون ہو؟ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ تم یہاں ایک نہ ایک دن ضرور آؤ گے۔ میں تمہارا ہی انتظار کر رہی تھی۔"

لڑکی کی آواز بالکل عام لڑکیوں کی طرح تھی اور ڈراونی نہیں تھی۔ اس سے فاران کو ذرا حوصلہ ہوا۔ اس نے اپنے خشک ہونٹوں پر زُبان پھیرتے ہوئے کہا۔

"میرے پاؤں زمین نے جکڑ لیے ہیں میں اپنی جگہ سے بالکل نہیں ہل سکتا۔"

لڑکی کی آواز آئی۔ "قدرت نے تمہیں میری مدد کے لئے بھیجا ہے۔"

فاران نے پوچھا۔ "میں تمہاری کیسے مدد کر سکتا ہوں جبکہ میرے پاؤں زمین نے پکڑ رکھے ہیں۔"

اس پر لڑکی کی آواز آئی۔ "تم مسلمان ہو اللہ کا تین بار نام لے کر اپنے جسم پر پھونک مارو۔ تمہارا طلسم غائب ہو جائے گا۔"

فاران نے تین بار اللہ کا نام لے کر اپنے جسم پر پھونک ماری تو زمین نے اس کے پاؤں چھوڑ دیئے۔ اس نے کھوپڑی کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں؟"

لڑکی کی آواز آئی۔ "میری کھوپڑی کے اوپر رکھا ہوا چراغ اٹھا کر زمین پر رکھ دو۔"

فاران آگے بڑھا۔ اس نے کھوپڑی کے اوپر سے چراغ اٹھایا اور اسے زمین پر رکھ دیا۔ لڑکی کی آواز آئی۔

"میری کھوپڑی کے درمیان میں ایک چاندی کا کیل ٹھکا ہوا ہے۔ اس کیل کو باہر کھینچ لو۔"

فاران نے ڈرتے ڈرتے کھوپڑی کے سر پر ہاتھ پھیرا تو واقعی ایک

کیل باہر کو اُبھرا ہوا تھا۔ فاران نے دل میں کلمہ پڑھ کر کیل کو زور سے باہر کھینچ دیا۔ کیل کے کھنچتے ہی کھوپڑی غائب ہو گئی اور اس کی جگہ وہاں سولہ، سترہ سال کی ایک خوبصورت لڑکی بیٹھی تھی جس نے سُرخ رنگ کی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ کانوں میں بالیاں تھیں اور ماتھے پر ہندو عورتوں کی طرح لال بندیا لگی تھی۔

فاران اس لڑکی کو دیکھ کر ہکا بکا ہو کر رہ گیا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ زندہ لڑکی کو دیکھ کر فاران کا خوف بھی جاتا رہا تھا۔ فاران نے لڑکی سے پوچھا۔

"تم کون ہو اور مُردہ کھوپڑی سے زندہ لڑکی کیسے بن گئیں؟"

لڑکی نے کہا۔ "فاران! میرا نام کانتا ہے میں ہندوستان کے شہر اِندر پرست کی رہنے والی ہوں۔ میرے ماں باپ ہندو تھے۔ وہ بتوں کی پوجا کرتے تھے۔ مگر مجھے بتوں کی پوجا سے نفرت تھی۔ میں سوچتی جو پتھر کا بُت اپنے منہ پر بیٹھی ہوئی مکھی نہیں اڑا سکتا وہ ہماری کیا مدد کر سکتا ہے۔ میں بتوں کی پوجا نہیں کرتی تھی۔ میرے ماں باپ مجھے مندر کے ایک پُجاری کے حوالے کر کے مر گئے۔ پجاری نے مجھ سے زبردستی بُتوں کی پوجا کرانی چاہی۔ جب میں نے انکار کر دیا اور کہا کہ تمہارے بُت جھوٹے اور پتھر ہیں۔ میں ان کی پوجا نہیں کروں گی تو پُجاری مجھے پکڑ کر اس غار میں لے آیا۔ اس نے میرے سر میں جادو کی کیل ٹھونک دی۔ جس کے اثر سے میں کھوپڑی بن گئی۔ جادوگر پُجاری میری کھوپڑی پر چراغ جلا کر یہ کہہ کر چلا گیا کہ اب تو ساری زندگی اسی غار میں کھوپڑی بن کر رہے گی"۔

فاران بڑی دلچسپی سے کانتا کی باتیں سُن رہا تھا۔ اس نے پوچھا۔ "لیکن تجھے میرا نام کیسے معلوم ہو گیا تھا؟"

کانتا نے کہا۔ "میری کھوپڑی تو پتھر کی سِل پر پڑی تھی مگر میں اپنی روح کی شکل میں غار میں موجود تھی۔ روح کو دوسروں کے نام معلوم ہو جاتے ہیں۔ جب تم یہاں آئے تو میں بڑی خوش ہوئی۔ میں جان گئی کہ تم مسلمان لڑکے ہو اور تمہارا نام فاران ہے اور تم میری ضرور مدد کرو گے۔ کیونکہ مسلمان صرف ایک خُدا کی عبادت کرتے ہیں اور کسی بُت کو نہیں پوجتے بلکہ وہ بُتوں کو توڑ ڈالتے ہیں۔ اسی لئے جب تم یہاں سے واپس جانے لگے تو میں نے تمہیں اپنی مدد کے لئے بُلا لیا۔ اس کے آگے جو کچھ ہوا تم کو معلوم ہی ہے۔"

فاران نے کہا۔ "کانتا! تمہاری کہانی عجیب و غریب مگر بڑی دلچسپ ہے۔ اب مجھے یہاں سے باہر نکالو۔ کیونکہ میں واپس ملتان جانا چاہتا ہوں جہاں میں رہتا ہوں"۔

کانتا کہنے لگی۔ "فاران! جہاں تم نے میری اتنی مدد کی ہے وہاں میری ایک اور خواہش بھی پوری کر دو۔"

فاران نے پوچھا۔ "اب تم کیا چاہتی ہو؟"

کانتا نے کہا۔ "ہمارے شہر اِندر پرست میں پجاری کے مندر میں ایک بت ہے۔ میں اپنی آنکھوں سے اس بُت کو پاش پاش ہوتے دیکھنا چاہتی ہوں۔ ہماری کتابوں میں لکھا ہے کہ اس بُت کو ایک مسلمان لڑکا اگر پاش پاش کرے گا اور مجھے یقین ہے کہ وہ مسلمان لڑکا تم ہی ہو۔ اگر تم میرے ساتھ چل کر اس بُت کو ٹکڑے ٹکڑے کر دو تو میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش پوری ہو جائے گی۔"

فاران کیسے انکار کر سکتا تھا۔ وہ تو خود بت پرست ہندوؤں کے سارے بُت پاش پاش کر دینا چاہتا تھا اس نے کہا۔ "ٹھیک ہے کانتا! میں تمہارے ساتھ چلوں گا اور میرے خُدا نے چاہا تو ایک ہی ضرب سے بُت کے ٹکڑے اڑا دوں گا۔ مگر سب سے پہلے اس اندھیری غار سے تو باہر نکلیں۔"

کانتا نے کہا "ایک خفیہ راستہ اس غار سے باہر جاتا ہے۔ میرے ساتھ آؤ ہم باہر نکل جائیں گے۔"

کانتا نے فاران کو ساتھ لیا اور غار کی ایک خفیہ سُرنگ سے باہر کُھلی فضا میں نکل آئی۔ آسمان پر تارے چمک رہے تھے۔ دور سامنے ملتان شہر کی دیوار پر جلتی ہوئی مشعلیں نظر آنے لگی تھیں۔ فاران اور کانتا شہر میں آ گئے۔ فاران نے کانتا کو ایک مسافر خانے میں ٹھہرا دیا دوسرے دن ایک قافلہ ملتان سے ہندوستان کے شہر اِندر پرست کی طرف جانے والا تھا۔ فاران اور کانتا اس قافلے میں شامل ہو کر اندر پرست شہر کی طرف روانہ ہو گئے۔

دوستو! اس زمانے میں دِلّی کو اندر پرست کے نام سے پکارا جاتا تھا اور وہاں پر راجہ ہرش کی حکومت تھی۔

قافلے میں مسافر گھوڑوں اور اونٹوں پر سفر کر رہے تھے۔ تین دن بعد یہ قافلہ اس زمانے کے اِندر پرست اور آج کے زمانے کے دلی شہر میں پہنچ گیا۔ اس وقت شام کے چراغ شہر کے مکانوں میں روشنی ہو گئے تھے۔ شہر کے بڑے دروازے کے اوپر مشعلیں

ہوتے ہیں۔ آدمی ان میں پھنس جائے تو پھر اس کا باہر نکلنا مشکل ہو جاتا ہے۔ بس وہیں چکر لگاتا رہتا ہے۔ فاران کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ وہ کافی دُور نکل آیا تھا۔ اب اس نے سوچا کہ واپس جانا چاہیے۔ چنانچہ وہ ریت کے ایک اونچے ٹیلے سے واپس مُڑ گیا۔ ایک ٹیلہ ختم ہوا تو دوسرا ٹیلہ آ گیا۔ اسی طرح دوسرے ٹیلے کے بعد تیسرا اور پھر چوتھا آ گیا جب ٹیلوں کا سلسلہ ختم نہ ہوا تو فاران پریشان ہو گیا۔ اسے باہر نکلنے کا راستہ نہیں مل رہا تھا۔ اس خیال سے وہ ریت کے ایک ٹیلے پر چڑھ گیا کہ وہاں سے شہر کی فصیل ضرور نظر آ جائے گی اور وہ اس طرف رُخ کرے گا۔

ریت کے ٹیلے کی چوٹی پر پہنچ کر فاران نے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی تو اسے اپنے چاروں طرف رات کے سرمئی اندھیرے میں ٹیلوں کی ابھری ہوئی چوٹیوں کے سوا اور کچھ نہ دکھائی دیا۔ اب تو وہ بہت پریشان ہوا کہ شہر کیسے پہنچے گا؟ وہ ٹیلے سے نیچے اُتر آیا۔ دوسرے ٹیلے پر چڑھا۔ وہاں سے بھی اسے شہر کی فصیل دکھائی نہ دی۔ فاران سمجھ گیا کہ وہ صحرا میں راستہ بھول گیا ہے۔ ایک بار تو یہ سوچ کر اسے پسینہ آ گیا کہ اگر اسے شہر کا راستہ نہ مِلا تو وہ اس صحرا میں بھٹک کر رہ جائے گا اور کوئی پتا نہیں کہ بھوک پیاس سے تڑپ تڑپ کر مر جائے۔ فاران گھبرا کر کبھی اس ٹیلے پر چڑھتا تو کبھی دوسرے ٹیلے پر مگر اسے شہر کی فصیل کی روشنیاں کہیں نظر نہ آئیں۔ اس کا سانس پھول گیا وہ ایک ٹیلے کے پاس ریت پر بیٹھ گیا اور خُدا سے دُعا مانگنے لگا۔ اتنے میں اسے زمین پر ایسی دھمک محسوس ہوئی جیسے گھوڑے دوڑتے آ رہے ہوں۔ اس کے ساتھ ہی اسے ایک گھوڑے کے ہنہنانے کی آواز سنائی دی۔ فاران یہ سوچ کر جلدی سے اٹھا کہ ضرور یہ کوئی مسلمان سوار ہو گا اور وہ اس سے فصیلِ شہر کو جانے والا راستہ معلوم کرے گا۔ اب رات کا اندھیرا پوری طرح سے چھا چُکا تھا۔ مگر صحرا میں رات کے وقت بھی اتنا اندھیرا نہیں ہوا کرتا۔ جب آسمان پر تارے نکل آتے ہیں تو ان کی روشنی جب ریت کے چاندی ایسے ذرّوں پر پڑتی ہے اور صحرا میں دھیمی دھیمی روشنی پھیل جاتی ہے۔

فاران کی نظریں اس طرف لگی تھیں جس طرف سے گھوڑے کے ہنہنانے کی آواز آئی تھی۔ پھر اسے تین گھوڑ سوار نظر آئے۔ فاران نے فوراً دیکھ لیا کہ ان گھوڑ سواروں کے لباس مسلمان عربوں ایسے نہیں تھے بلکہ ہندو سپاہیوں کی طرح کے تھے۔ فاران ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ وہاں سے بھاگ جائے یا کھڑا رہے کہ ہندو گھوڑ سوار اس کے سر پر پہنچ گئے۔ فاران کا لباس عرب مسلمانوں ایسا تھا۔ اسے دیکھتے ہی ایک ہندو گھوڑ سوار نے تلوار کھینچ لی اور اپنے ساتھیوں سے کہا۔

"یہ مسلمان عرب ہے اس کی گردن اُڑا دو۔"

دوسرے ہندوؤں نے بھی تلواریں کھینچ لیں۔ فاران نہتا تھا۔ اگر اس کے پاس تلوار بھی ہوتی تو بھی وہ ان تینوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ اسے اور تو کچھ نہ سوجھا۔ وہ ایک ٹیلے کی طرف بھاگ اٹھا۔ پیچھے سے ہندو سپاہی نے آواز دی۔

"بھاگنے نہ پائے۔ میں اس مسلمان عرب کا سر کاٹ کر اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔"

گھوڑ سواروں نے فاران کے پیچھے گھوڑے ڈال دیئے۔ چاہے ٹیلوں میں بُھول بھلیاں تھیں مگر ایک پیدل بھاگنے والا نوجوان تین گھوڑ سواروں سے بچ کر کہاں جا سکتا تھا۔ چنانچہ بہت جلد ہندو گھوڑ سوار فاران کے سر پر پہنچ گئے۔ ایک نے گھوڑے کو دوڑاتے ہوئے جُھک کر فاران کی گردن پر وار کیا۔ اگر فاران جلدی سے بیٹھ نہ جاتا تو اس کی گردن کٹ کر ریت پر گر جاتی۔

دوسرا ہندو گھوڑ سوار تلوار لہراتا فاران کی طرف بڑھا تو فاران چھلانگ لگا کر ایک ٹیلے کی ڈھلان پر جا گرا اور لڑھکنے لگا۔ اس کے بعد فاران ایک جگہ شگاف میں سے نیچے گر گیا۔ ٹیلے کی ڈھلان پر شاید کوئی سُوراخ تھا۔ فاران اس میں سے نیچے ایک غار میں گرا اور وہیں پڑے پڑے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کوئی معجزہ یا کرامت ہو گئی ہے۔ شاید خُدا نے اس کی دُعا سُن لی تھی اور اسے بچا لیا تھا۔ مگر خطرہ ابھی تک اس کے سر پر منڈلا رہا تھا۔ اسے ٹیلے کے اوپر ہندو گھوڑ سواروں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ ایک دوسرے کو پُکار رہے تھے۔

"کہاں جا سکتا ہے وہ مسلمان۔ یہیں کسی جگہ چُھپا ہوا ہو گا۔ ابھی تلاش کر کے اس کا سر کاٹ دیتے ہیں۔"

پھر ایک ہندو نے بلند آواز سے کہا۔

"ہم نے تمہیں چاروں طرف سے گھیر لیا ہے۔ تم ہم سے بچ کر نہیں جا سکتے۔ اپنے آپ باہر نکل آؤ"۔

فاران ٹیلے کے نیچے گھپ اندھیرے غار میں سانس روک کر بیٹھا رہا۔ ہندو گھوڑ سوار اوپر اسے تلاش کر رہے تھے۔ پھر ایک ہندو نے

روشن تھیں۔ کانتا نے فاران سے کہا۔
"پجاری کا مندر شہر کے اندر ایک چھوٹے سے ٹیلے پر ہے۔ وہاں قریب ہی میرے ماں باپ کا مکان ہے جو اب خالی پڑا ہے۔ ہم اس مکان میں چلتے ہیں۔"
سرائے سے نکل کر کانتا نے فاران کو ساتھ لیا اور شہر کے دروازے سے گذر کر اپنے خالی مکان میں آگئی۔ یہاں دو کوٹھڑیاں تھیں۔ ایک کوٹھڑی میں کانتا اور دوسری کوٹھڑی میں فاران نے رات گذاری۔ دوسرے دن صُبح صُبح اٹھ کر فاران نے وضو کیا۔ نماز پڑھی اور خُدا سے دُعا مانگی کہ اے اللہ میاں! مجھے اتنی توفیق عطا کر کہ میں جھوٹے بت کو ایک ہی ضرب سے پاش پاش کر سکوں۔ کانتا ناشتہ تیار کر رہی تھی۔ فاران نے کہا۔
"کانتا! تم کہتی ہو کہ پُجاری جادوگر بھی ہے کیا اسے جادو کے ذریعے تمہارے اور میرے یہاں آنے کا پتا نہیں چل جائے گا؟"
کانتا نے مُسکرا کر کہا۔ وہ غیب کا حال نہیں جانتا۔ اپنے جادو سے وہ زندہ انسان کو مار سکتا ہے مگر یہ معلوم نہیں کر سکتا کہ میں اس وقت کہاں ہوں؟
فاران نے ناشتہ کیا۔ کانتا نے اپنی ساڑھی کے پلو میں سے چاندی کا وہ کیل نکال کر فاران کو دیا جو جادوگر پجاری نے کانتا کے سر میں ٹھونک کر اسے زندہ لڑکی سے کھوپڑی بنا دیا تھا۔ کانتا کہنے لگی۔
"تمہیں کسی نہ کسی طرح یہ طلسمی کیل بت کے پاؤں میں ٹھونکنا ہو گی۔ بت کے داہنے پاؤں میں انگوٹھے کے پاس ایک چھوٹا سا سوراخ ہے۔ تم یہ کیل بت کے پاؤں کے سوراخ میں ہاتھ سے ٹھونک دینا۔ اس کے ساتھ ہی بت منہ کے بل گر پڑے گا اور ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔"
فاران نے کانتا سے چاندی کا طلسمی کیل لے لیا اور کہنے لگا۔
"میرا خیال ہے مجھے رات کے اندھیرے میں مندر میں داخل ہونا چاہیے۔
کانتا بولی۔ "ہاں! آدھی رات کے بعد مندر خالی ہوتا ہے۔ میں بھی تمہارے ساتھ ہوں گی۔"
فاران نے کہا۔ "تمہیں ساتھ جانے کی کیا ضرورت ہے۔ کہیں پُجاری تم پر پھر کوئی جادو نہ کر دے؟"
کانتا نے نفرت سے کہا۔ "میں اس ظالم بُت پرست پجاری سے بھی بدلہ لینا چاہتی ہوں۔ تم دیکھ لو گے کہ میں اس سے کیسے بدلہ لیتی ہوں؟"
دونوں نے سارا دن خالی مکان میں گزار دیا پھر شام ہو گئی۔ اس کے بعد رات آگئی۔ جب رات آدھی سے زیادہ گزر گئی تو کانتا نے فاران سے کہا۔
فاران! بت کو پاش پاش کرنے اور ظالم پجاری سے بدلہ لینے کا وقت آگیا ہے۔"
دونوں مکان سے نکل کر قدیم شہر کی نیم تاریک گلیوں میں آگئے۔ کانتا کو راستے کا پتا تھا۔ وہ مندر والے ٹیلے کے پیچھے آگئی۔ فاران اس کے ساتھ تھا۔ کانتا نے اس کے کان کے قریب منہ لا کر سرگوشی میں کہا۔ "وہ جو سامنے بڑا چبوترہ ہے اس کے اندر سے ایک خفیہ راستہ مندر کے بڑے کمرے میں جاتا ہے۔ میرے ساتھ آؤ۔"
چبوترے کے اردگرد اندھیرا تھا۔ اس کے اندر اندھیری سیڑھیاں جاتی تھیں۔ کانتا فاران کو لے کر اندھیری سیڑھیاں اتر گئی۔ آگے ایک تنگ سرنگ تھی۔ یہ سرنگ مندر کے بڑے کمرے میں نکلتی تھی۔ فاران نے دیکھا کہ مندر کا یہ کمرہ بالکل خالی تھا۔ کمرے میں ایک پتھر کا بت کھڑا تھا جس کی آنکھوں میں سُرخ لعل چمک رہے تھے۔ کانتا نے سرگوشی میں کہا۔
"بس یہی وقت ہے۔ جاؤ اور اس جھوٹے بُت کے پاؤں میں یہ چاندی کی کیل ٹھونک آؤ"۔
فاران نے دل میں کلمہ شریف کا وِرد شروع کر دیا۔ اس کے اندر ایک عجیب سے طاقت آگئی تھی۔ اس کا سینہ اللہ کی محبت کے جذبے سے بھر گیا تھا۔ وہ بے دھڑک بُت کے پاس آگیا۔ اس نے جھک کر دیکھا اس کے داہنے پاؤں میں انگوٹھے کے پاس سوراخ تھا۔ فاران نے اللہ کا نام لے کر چاندی کی کیل بت کے پاؤں میں ٹھونک دی۔
اس کے بعد وہ اور کانتا پیچھے ہٹ گئے۔ بُت پر زلزلہ سا آگیا۔ وہ آگے کو جُھکا اور پھر دھڑام سے منہ کے بل گرا اور پاش پاش ہو گیا۔ بُت کے گرتے ہی کانتا بھاگ کر بت کے ٹوٹے ہوئے پاؤں کے ٹکڑوں کے پاس گئی۔ وہاں چاندی کی کیل پڑی تھی۔ کانتا نے چاندی کی کیل اٹھا لی اور فاران کے پاس آکر کہا۔
"جلدی سے میرے ساتھ آؤ۔"
اور وہ ایک اندھیرے تہہ خانے میں گھس گئی۔ بت کے گرنے

کالا سانپ، سومنات کی بدرُوح

فاران نے آنکھیں کھول دیں۔

اُس نے اپنے اردگرد دیکھا۔ پہلی پہلی تو اس نے یہ محسوس کی کہ وہ ابوہاشم بزرگ کی خانقاہ میں نہیں ہے بلکہ ایک دریا کے کنارے اکیلا بیٹھا ہے۔ آس پاس سنگلاخ کالے سیاہ پہاڑی ٹیلے ہیں۔ دریا کا پانی پتھروں سے ٹکراتا ہوا گذر رہا ہے۔ فاران نہیں سمجھ سکا تھا کہ وہ بغداد شہر سے نکل کر کہاں آگیا ہے۔ ابھی وہ یہ سوچ رہا تھا کہ اسے بزرگ ابوہاشم کی آواز سنائی دی۔

"فاران بیٹا! اس وقت تم 391 ہجری (1002 عیسوی) کے پشاور شہر کے قریب ہو۔ یہ دریائے کابل ہے۔ اس وقت سلطان محمود غزنوی کی فوجیں پشاور کے ہندو راجا جے پال کو شکست دینے کے لئے پشاور کے قریب پہنچ چکی ہیں"۔

فاران نے بڑے ادب سے کہا "حضور! کیا آپ نے مجھے وہ خفیہ طاقت عنایت فرمادی ہے جس کا آپ نے وعدہ فرمایا تھا"؟

اس پر بزرگ ابوہاشم کی آواز آئی "فاران! تمہاری بائیں جانب ایک گول پتھر پڑا ہے۔ اس پتھر کو اٹھاؤ"۔

فاران نے بائیں جانب دیکھا تو اسے نیلے رنگ کا ایک گول پتھر نظر پڑا۔ اس نے پتھر کو ہٹایا تو کیا دیکھتا ہے کہ اس کے نیچے سونے کی ایک انگوٹھی پڑی ہے۔ ابوہاشم کی آواز آئی۔

"فاران! اس انگوٹھی کو اپنے بائیں ہاتھ کی دوسری اُنگلی میں پہن لو"۔

فاران نے انگوٹھی اٹھائی۔ اس انگوٹھی پر "اللہ" کا مُقدّس نام لکھا ہوا تھا۔ فاران نے انگوٹھی اپنے بائیں ہاتھ کی دوسری اُنگلی میں پہن لی۔ ابوہاشم بزرگ کی آواز آئی۔

"اپنے دل میں اللہ کا نام لے کر انگوٹھی کو چُوم لو"۔

فاران نے ایسا ہی کیا۔ اس نے دل میں اللہ کا نام لیا اور انگوٹھی کو چُوم لیا۔ انگوٹھی کو چُومتے ہی فاران کو اپنا جسم پھول سے بھی ہلکا لگنے لگا۔ اب جو اس نے دیکھا تو اسے زمین، پہاڑیاں، دریا، سب کچھ نظر آرہا تھا مگر اپنا جسم نظر نہیں آرہا تھا۔ فاران گھبرا گیا کہ اس کا جسم کہاں چلا گیا؟ ہاتھ پاؤں، بازو، پیٹ ۔۔۔ یہ سب کچھ اسے نظر کیوں نہیں آرہا؟ اس کی گھبراہٹ ابوہاشم بزرگ کی آواز نے کسی حد تک دور کردی۔ آواز نے کہا۔

"فاران! یہ انگوٹھی کا اثر ہے کہ جس نے تمہیں غائب کر دیا ہے۔ اس وقت تم ہر شے کو دیکھ سکتے ہو مگر تمہیں کوئی نہیں دیکھ سکتا"۔

فاران نے کچھ پریشان سا ہو کر پوچھا "مگر حضور! میں دوبارہ نظر نہیں آؤں گا کیا"؟ اس پر بزرگ ابوہاشم کی آواز آئی۔

"نہیں بیٹا! ایسی بات نہیں ہے۔ جب تم ظاہر ہونا چاہو تو انگوٹھی کو دوبارہ چُوم لو۔ تم پھر نظر آنے لگو گے"۔

فاران نے اندازے سے اپنا ہاتھ اوپر لے جاکر انگوٹھی کو چُوم لیا۔ انگوٹھی کو چُومتے ہی فاران اپنے آپ کو پھر سے دکھائی دینے لگا۔ ابوہاشم کی آواز آئی۔

کاشتا نے کہا "یہاں میرا کوئی نہیں ہے۔ میں اپنے گاؤں چلی جاؤں گی۔ وہاں میری ایک سہیلی رہتی ہے۔ میں بھی اس کے ساتھ رہوں گی۔ میں تمہارا شکریہ ادا کرتی ہوں کہ تم نے میرے لئے اتنی تکلیف اٹھائی۔"

فاران نے کہا۔ "تکلیف کیسی کاشتا! بتوں کو توڑنا تو ہر مسلمان کا فرض ہے۔" کاشتا نے فاران کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولی۔

"فاران بھائی! کیا تم مجھے مسلمان نہیں بناؤ گے۔ میں بھی تمہاری طرح مسلمان بن کر ایک خُدا کی عبادت کرنا چاہتی ہوں۔"

فاران کا چہرہ خُوشی سے چمک اٹھا۔ اس نے کہا۔

"کاشتا بہن! میرے لئے اس سے زیادہ خوشی کی اور کیا بات ہو سکتی ہے۔"

کاشتا نے کہا "تو پھر مجھے مسلمان کر دو۔ کیا اس کے لئے کوئی خاص رسم ادا کرنی پڑے گی؟"

فاران نے کہا۔ "اسلام بڑا سادہ دین ہے۔ جو شخص بھی دل سے خُدا کے ایک ہونے رسولؐ خُدا کے آخری نبیؐ ہونے کا اقرار کرتا ہے وہ مسلمان ہو جاتا ہے۔"

کاشتا نے کہا۔ "تو پھر مجھے کلمہ پڑھا دو۔"

فاران نے کاشتا کو پانچ بار کلمہ شریف پڑھایا۔ کاشتا نے بلند آواز میں کہا کہ "میں دل سے اقرار کرتی ہوں کہ خدا ایک ہے اور محمدؐ رسول اللہ صلعم اللہ کے نبی ہیں اور ان کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا اور قرآن اللہ پاک کا کلام ہے۔"

فاران نے کہا "مبارک ہو کاشتا تم مسلمان ہو گئی ہو۔"

کاشتا کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو آ گئے۔ اس کے بعد فاران نے کاشتا کو پانچوں نمازیں بھی سکھا دیں اور اس کا نام کاشتا سے بدل کر زبیدہ رکھ دیا۔ اس روز زبیدہ اپنی سہیلی کے گاؤں کی طرف روانہ ہو گئی۔ فاران سے رخصت ہوتے وقت اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

دوسرے دن فاران بھی ایک قافلے میں شامل ہو کر ملتان کی طرف چل دیا۔ تین دن بعد ملتان پہنچا تو اسے پتا چلا کہ سالار عقبہ بغداد تشریف لے گئے ہیں۔ تب فاران کو یاد آگیا کہ آقا زوقاش نے اسے کہا تھا کہ وہ بغداد جا کر بزرگ ابو ہاشم سے ملاقات کرے۔ ابو ہاشم اسے ایک ایسی خفیہ طاقت اللہ کے حکم سے عطا کریں گے جس کی مدد سے وہ محمد بن قاسم اور محمود غزنوی سے لے کر قائد اعظم تک کا طویل اور خطروں سے بھرا ہوا سفر آسانی سے طے کر سکے گا۔

دو دن بعد ایک قافلہ دیبل جا رہا تھا۔ فاران اس قافلے میں شامل ہو کر دیبل پہنچ گیا۔ پھر وہاں سے ایک بادبانی جہاز میں سوار ہوا اور بغداد کی طرف روانہ ہوا۔

بغداد پہنچنے کے بعد فاران پتا پوچھتے پوچھتے بزرگ ابو ہاشم کی خانقاہ پر جا پہنچا۔ بزرگ ابو ہاشم کی خانقاہ دریائے دجلہ کے کنارے ایک چشمے کے پاس تھی۔ چاروں طرف میٹھی کھجوروں کے جھنڈ تھے۔ ہر طرف نور برس رہا تھا۔ کچھ لوگ خانقاہ کے باہر ادب سے بیٹھے تھے۔ اتنے میں خانقاہ کے اندر سے ایک دراز قد بزرگ باہر تشریف لائے۔ سب نے ان کی تعظیم کی بزرگ کا لباس عربی تھا۔ سر پر عربی رومال بندھا ہوا تھا۔ سفید نورانی ڈاڑھی تھی۔ سرخ سفید چہرے پر خدا کا نور برس رہا تھا۔ آنکھوں میں آسمانی چمک تھی۔ انہوں نے بلند آواز میں سب کو اسلام علیکم کہا۔ فاران نے بھی سب لوگوں کے ساتھ وعلیکم السلام کہا اور ادب سے اٹھ کھڑا ہوا۔ یہی بزرگ ابو ہاشم تھے ابو ہاشم نے ایک نظر فاران پر ڈالی۔ فاران کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کے خُون میں سنسنی دوڑ گئی ہے۔ ابو ہاشم نے فرمایا۔

"نماز کا وقت ہو گیا ہے۔" پھر انہوں نے امامت کی اور نماز پڑھائی۔ فاران نے ان کے پیچھے دوسرے عرب مسلمانوں کے ساتھ نماز پڑھی۔ نماز کے بعد ابو ہاشم نے فاران کو اشارے سے اپنے پاس بُلایا۔ فاران بڑے ادب سے دو زانو ہو کر بزرگ ابو ہاشم کے پاس بیٹھ گیا۔ ابو ہاشم کے نورانی چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ فاران نے محسوس کیا کہ اس باعمل مسلمان بزرگ کی شخصیت میں ایک حیرت انگیز کشش تھی۔ بزرگ ابو ہاشم نے آہستہ سے فرمایا۔

"بیٹا! میرے ساتھ خانقاہ میں آجاؤ۔" وہ فاران کو ساتھ لے کر خانقاہ میں تشریف لے گئے۔ خانقاہ کی کوٹھڑی میں زمین پر صف بچھی تھی۔ صف پر مصلےٰ بچھا ہوا تھا۔ بزرگ ابو ہاشم بڑے سکون سے مصلے پر بیٹھ گئے۔ فاران کو انہوں نے اپنے قریب بٹھا لیا اور فرمایا۔

"بیٹا! میں جانتا ہوں تم کئی سو برس آگے کے زمانے سے مسلمان ملک پاکستان سے آئے ہو۔ پاکستان اسلام کا قلعہ ہے اور بے مثال قربانیوں کے بعد حاصل کیا گیا ہے۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تم اسلام کی تاریخ کے ساتھ ساتھ سفر کرو گے اور تمہیں آقا زوناش نے میرے پاس بھیجا ہے۔ اپنے طویل اور خطرناک سفر میں تمہیں

"فاران! اس وقت تمہارے پاس یہی طاقت تمہاری سب سے بڑی طاقت ہے۔ اگر تمہارے لمبے اور خطرناک تاریخی سفر میں کبھی ایسا وقت آجائے کہ تم کسی مصیبت میں ایسے پھنس جاؤ کہ وہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ نظر نہ آتا ہو تو دل میں اللہ کا نام لے کر انگوٹھی کو چُوم لینا۔ تم غائب ہو جاؤ گے اور مصیبت سے نکل جاؤ گے"۔

فاران نے کہا۔ "لیکن حضور! کیا میں مَر بھی سکتا ہوں؟ میرا مطلب ہے کہ میں تو پچھلے زمانے میں سفر کر رہا ہوں اور میں ابھی کیسے مر جاؤں گا"۔

ابوہاشم کی آواز آئی۔ "تم ابھی نہیں مَر سکو گے۔ کیونکہ تم پیچھے کے زمانے میں آئے ہوئے ہو اور ظاہر ہے کہ زندہ رہو گے اس وقت تک جب تک کہ تم اپنے زمانے میں واپس لاہور نہیں پہنچ جاتے"۔

فاران نے پوچھا۔ "حضور! اگر کسی نے مجھ پر تلوار سے وار کر دیا یا مُجھے جلتی ہوئی آگ میں ڈال دیا تو کیا ہو گا"؟ ابوہاشم کی آواز آئی۔

"تم پر نہ تلوار کا اثر ہو گا نہ آگ کا۔ اور جب تم انگوٹھی چُومنے کے بعد غائب ہو جاؤ گے تو تمہارے اندر دس آدمیوں کی طاقت پیدا ہو جائے گی۔ لیکن ایک بات کا خیال رکھنا۔ اپنی اس طاقت کو اللہ کے دُشمنوں کے خلاف اور مظلوموں کی حمایت میں استعمال کرنا۔ اگر تو نے اس طاقت کو اپنے ذاتی فائدے یا لالچ کے لئے استعمال کیا تو یہ طاقت تم سے واپس چھین لی جائے گی اور تم مصیبتوں کا مقابلہ کرنے کے لئے اکیلے رہ جاؤ گے"۔

فاران نے کہا۔ "حضور! میں وعدہ کرتا ہوں کہ اللہ کی عطا کی ہوئی اِس طاقت کو ہمیشہ اللہ کے واسطے اور مظلوموں کی حمایت کے لئے استعمال کروں گا اور اللہ کے دُشمنوں کے خلاف ہی استعمال کروں گا"۔

ابوہاشم نے کہا۔ "شاباش! اب شہر پشاور کی طرف جاؤ۔ کیونکہ پشاور شہر کے دروازے بند ہونے والے ہیں۔ راجا جے پال محمود غزنوی کے لشکر کا مقابلہ کرنے کے لئے تیاریاں کر رہا ہے"۔

فاران نے کہا۔ "حضور! میں نے اپنے اسکول میں تاریخ کی کتاب میں اس لڑائی کا حال پڑھا تھا"۔ راجا جے پال کو غزنوی نے زبردست شکست دی تھی اور راجا جے پال نے اپنے آپ کو آگ میں ڈال کر جلا لیا تھا۔"

ابوہاشم کی آواز آئی "تُم مسلمان لشکر کی فتح کو اپنی آنکھوں سے دیکھو گے۔ اچھا خدا حافظ"!

فاران نے جلدی سے پوچھا۔ "حضور! آپ سے پھر کب ملاقات ہو گی"؟ مگر ابوہاشم کی طرف سے کوئی جواب نہ آیا۔ بزرگ ابوہاشم تشریف لے جا چکے تھے۔

فاران نے ایک بار پھر انگوٹھی کو غور سے دیکھا۔ یہ بڑی ہی سادہ سی سونے کی انگوٹھی تھی مگر اس قدر کرامت والی انگوٹھی تھی کہ اس کو

چُومنے کے بعد فاران غائب ہو سکتا تھا۔ وہ دریا کنارے سے اُٹھا اور شہر پشاور کی طرف چل پڑا۔ پہاڑی ٹیلوں سے نکلنے کے بعد اس کو سامنے ایک میدان نظر آیا جس کے پار شہر پشاور کی فصیل تھی۔ فاران کو ابھی محمود غزنوی کا اسلامی لشکر دِکھائی نہیں دیا تھا۔ مگر لوگ گھبرائے ہوئے شہر کے دروازے میں داخل ہو رہے تھے۔ فاران نے ایک آدمی سے پوچھا۔

"کیوں بھائی! تم اتنے گھبرائے ہوئے کیوں ہو"؟

یہ آدمی ہندو تھا اور اس کے سر پر لمبی بودی تھی۔ اُس کا آدھا جسم ننگا تھا اور دھوتی باندھ رکھی تھی۔ اس نے کہا۔

"کیا تمہیں نہیں معلوم مسلمان بادشاہ محمود غزنوی پشاور پر حملہ کرنے اپنے لشکر کے ساتھ چلا آ رہا ہے؟ تم بھی جان بچا کر شہر میں داخل ہو جاؤ"۔

مگر فاران محمود غزنوی کو اور اُس کے لشکر کے مسلمان مجاہدوں کو ایک نظر دیکھنا چاہتا تھا۔ چُناں چہ وہ شہر میں داخل نہ ہوا بلکہ ان پہاڑیوں کی طرف چلا جدھر سے سلطان محمود غزنوی مسلمانوں کا لشکر لے کر آ رہا تھا۔

فاران ایک نظر مسلمانوں کے عظیم غازی اور سپہ سالار سلطان محمود غزنوی کو دیکھنا چاہتا تھا۔ جس کی بہادری اور دلیری کے واقعات سے تاریخ کے صفحات بھرے پڑے تھے۔ فاران خود بھی اس زمانے کے افغان مسلمان نوجوانوں کے لباس میں تھا۔ دور اسے پہاڑیوں کے درمیان ایک جگہ گرد و غبار نظر پڑا۔ قریب جا کر دیکھا تو مسلمان مجاہدوں کے فوج وہاں خیمے لگا رہی تھی۔ فاران سلطان محمود غزنوی کو دیکھنا چاہتا تھا مگر اس کے خیمے تک پہنچنا آسان نہیں تھا۔ سلطان کی حفاظت کے لئے اس کے خیمے کے باہر دو مجاہد موجود تھے۔ اچانک فاران کو اپنی انگوٹھی کا خیال آگیا۔ وہ تو غائب ہو کر سلطان محمود غزنوی کے خیمے میں پہنچ سکتا تھا۔ وہ ایک درخت کے پیچھے آکر بیٹھ گیا۔ یہاں اس نے دل میں اللہ کا نام دہرایا اور انگوٹھی کو چوم لیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ غائب ہو گیا۔ وہ لوگوں کی نظروں سے اوجھل تھا۔ خود لوگوں کو دیکھ سکتا تھا مگر دوسرے لوگ اسے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ فاران مسلمان مجاہدوں کے خیموں کے درمیان سے گذرتا آگے بڑھا۔

ایک جگہ اسے ایک گول خیمہ نظر آیا جس کے اوپر اسلامی پرچم لہرا رہا تھا۔ خیمے کے اردگرد مسلمان مجاہد پہرا دے رہے تھے۔ وہ سمجھ گیا کہ یہی اسلام کے عظیم جرنیل سلطان محمود غزنوی کا خیمہ ہے۔ وہ آگے بڑھا۔ اور پہرے پر کھڑے مجاہدوں کے درمیان سے نکل کر خیمے کے دروازے پر آگیا۔ خیمے کے دروازے کا پردہ گرا ہوا تھا۔ اندر سے کسی مرد کی بھاری آواز آرہی تھی۔ فاران کو پردہ اٹھانے کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ وہ آواز کی لہروں کی طرح پردے کے درمیان سے گذر کر خیمے کے اندر چلا گیا۔ کیا دیکھتا ہے کہ خیمے میں قالین بچھے ہیں۔ درمیان میں گول میز پر جنگ کا نقشہ بنا ہوا ہے۔ سامنے کی جانب ایک اونچا لمبا خوش شکل جواں مرد سپہ سالار کے لباس میں موجود ہے۔ سر پر لوہے کا خود ہے۔ گردن پر لوہے کی باریک جالی کی جھالر لٹک رہی ہے۔ سینے پر چمڑے کی زرہ ہے جس پر کلمہ شریف لکھا ہوا ہے۔ اس جوان کے آس پاس دوسرے فوجی جرنیل بھی کھڑے نقشے کو دیکھ رہے تھے۔ ایک جرنیل نے اس جوان کو مخاطب کر کے کہا۔

"سلطان معظم! ہمارے آدمی نے خبر دی ہے کہ اس وقت راجا جے پال کے پاس بارہ ہزار سوار، بتیس ہزار پیادے اور تین سو ہاتھی موجود ہیں"۔

فاران سمجھ گیا کہ یہی جوان نامور مسلمان سپہ سالار سلطان محمود غزنوی ہے۔ وہ خاموشی سے ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ وہ سلطان محمود غزنوی کو اتنے قریب سے دیکھ کر بے حد خوش ہوا تھا۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ جس جنگ کا حال اس نے اسکول میں اپنی تاریخ کی کتاب میں پڑھا تھا اسی جنگ کو وہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھے گا۔ اس نعمت کے لئے وہ دل میں اللہ کا شکر ادا کرنے لگا۔ سلطان محمود غزنوی نے نقشے پر ایک جگہ خنجر کی نوک رکھتے ہوئے کہا۔

"ہمارا ایک لشکر اِدھر سے راجا جے پال کی فوج پر حملہ کرے گا۔ دوسرا لشکر بائیں جانب سے آگے بڑھے گا۔ میں خود مجاہدوں کو ساتھ لے کر سامنے کی جانب سے دشمن پر حملہ کروں گا"۔

ایک مسلمان جرنیل نے کہا۔ "سلطانِ معظم! آج آٹھ محرم ہے۔ ہمیں آج ہی کفار پر چڑھائی کر دینی چاہئیے"۔

سلطان محمود غزنوی نے ایک لمحے کے لئے کچھ سوچا۔ پھر حکم دیا۔ "ہم اللہ کا نام لے کر کافروں کو تہہِ تیغ کرنے کے لئے آج ہی آگے بڑھیں گے"۔

فاران جلدی سے خیمے سے نکل کر راجا جے پال کے شہر کی طرف چل دیا۔ اسے معلوم تھا کہ مسلمانوں اور کافروں میں زبردست جنگ شروع ہونے والی ہے۔ وہ اس جنگ کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا تھا۔ چنانچہ وہ قلعے کے دروازے کے پاس ایک ٹیلے پر چڑھ کر کھڑا ہو گیا۔

قلعے کا دروازہ کھلا۔ راجا جے پال اپنے ساتھ بارہ ہزار گھوسوار، بتیس ہزار پیادے اور تین سو ہاتھی لے کر محمود غزنوی کی فوج کا مقابلہ

کے شور سے مندر کے نوکر چاکر اور پجاری کوٹھڑیوں سے نکل کر باہر آگئے۔ بت کے ٹکڑوں کو دیکھ کر وہ اپنے سر پیٹنے لگے۔ جادوگر پجاری کی آنکھیں غصے سے سرخ ہو رہی تھیں۔ وہ چلایا۔

"اس بت کو کسی مسلمان نے توڑا ہے۔ اس کو پکڑو۔ وہ مندر سے زیادہ دُور نہیں گیا ہو گا۔"

ملازم مندر سے نکل کر چاروں طرف کو دوڑے مگر فاران تو کاتنا کے ساتھ تہہ خانے میں چھپا ہوا تھا۔ جادوگر پجاری بے چینی سے اِدھر اُدھر ٹہل رہا تھا۔ اس نے ایک طلسمی کتاب میں اتنا پڑھ لیا تھا کہ اگر یہ بت کبھی ٹکڑے ٹکڑے ہوا تو کوئی مسلمان ہی ایسا کرے گا جو ایک خُدا کا عبادت گزار ہو گا۔

وہ لپک کر اپنی کوٹھڑی میں گیا اور پیالے میں پانی بھر کر اس پر طلسم کا منتر پھونکا اور جھک کر دیکھا کہ اسے اس مسلمان کا چہرہ نظر آجائے جس نے مندر کے سب سے بڑے بت کو توڑا ہے۔ مگر پانی میں کسی کی شکل نظر نہ آئی۔
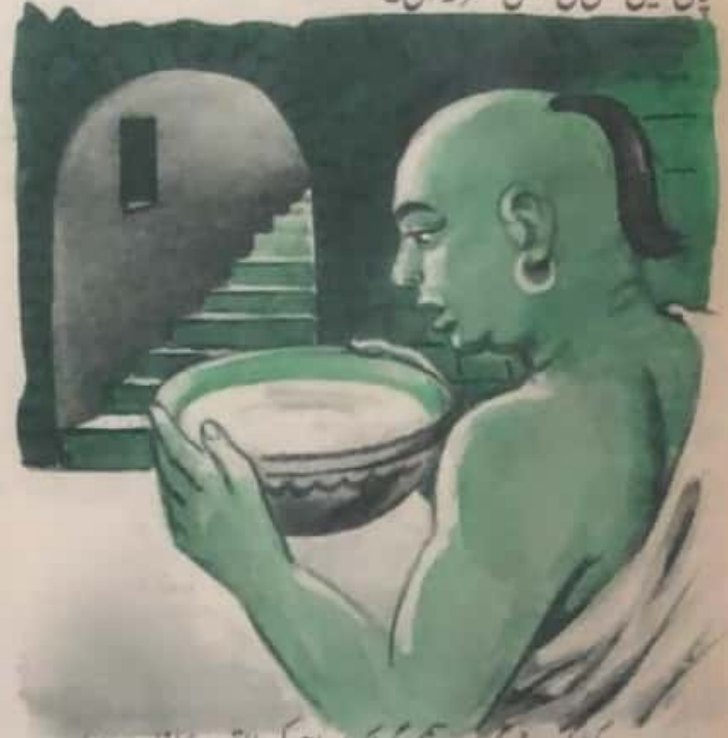
پجاری سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ سمجھ گیا کہ اسلام کی طاقت کا غلبہ ہے اور اس کا علم نہیں چل سکتا۔ مگر جادوگر پجاری نے شکست تسلیم نہ کی اور ایک بار پھر پانی پر طلسمی منتر پڑھ کر پھونکا۔ جونہی اس نے منتر پھونکا تو اسے ایک زبردست جھٹکا لگا اور وہ پیچھے کو گرا اور گرتے ہی بے ہوش ہو گیا۔ مندر میں ایک بار پھر گہری خاموشی چھا گئی۔ کاتنا نے فاران سے کہا۔

"ظالم بُت پرست جادوگر سے بدلہ لینے کا وقت آگیا ہے۔ میرے ساتھ آؤ۔"

وہ تہہ خانے سے باہر آئی تو مندر کے کمرے کے فرش پر بت کے ٹکڑے بکھرے پڑے تھے۔ کاتنا نے چاندی کا کیل اپنے ہاتھ میں لے رکھا تھا۔ دوسرے ہاتھ میں اس نے بت کا ایک ٹوٹا ہوا پتھر اٹھا لیا اور دبے پاؤں مندر کے پجاری کے کمرے کی طرف بڑھی فاران اس کے ساتھ تھا۔ کوٹھڑی میں جادوگر پجاری فرش پر بے ہوش پڑا تھا۔ کاتنا کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ اس نے فاران سے کہا۔

"اس کافر جادوگر کو اس کے ظلم کی سزا دینے کا اس سے اچھا موقع نہیں مل سکتا۔"

یہ کہہ کر کاتنا جلدی سے پجاری کے پاس بیٹھ گئی۔ پھر اس نے کیل کی نوک پجاری کے سر پر رکھی اور زور سے پتھر اس کے اوپر مار دیا۔ طلسمی کیل پجاری کی کھوپڑی میں گھس گئی۔ اس کے ساتھ ہی پجاری کے حلق سے عجیب ڈراونی آواز نکلی اور وہ ایک کھوپڑی بن گیا۔

کاتنا نے کہا۔ "تو نے میرے ساتھ جو سلوک کیا تھا میں وہی سلوک تمہارے ساتھ کر رہی ہوں۔ میں تجھے ایسی جگہ پھینکوں گی جہاں سے تُو قیامت تک باہر نہیں نکل سکے گا۔"

یہ کہہ کر کاتنا نے کھوپڑی کو اٹھا لیا اور فاران سے کہا "چلو فاران! اب یہاں سے نکل چلو۔"

دونوں اسی خفیہ راستے سے مندر کے باہر آگئے۔ باہر رات گھُپ اندھیری تھی۔ کاتنا نے کہا۔

"فاران! اب ہم دریا پر چلیں گے۔" دریا وہاں سے زیادہ دُور نہیں تھا۔ دریا قلعے کی فصیل کے ساتھ بہتا تھا۔ دریا پر آکر کاتنا نے جادوگر پجاری کی کھوپڑی کو دریا میں پھینک دیا اور خُوش ہو کر کہنے لگی۔

"اب یہ شخص کسی پر اپنا جادو نہیں چلا سکے گا۔ اس کا جادو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا ہے۔"

فاران نے وہ رات کاتنا کے خالی مکان میں گزاری۔ صبح اٹھ کر اس نے نماز پڑھی اور خُدا کے حضور سجدہ کر کے اس کا شکر ادا کیا کہ اس کی دی ہوئی طاقت سے وہ بت کو پاش پاش کر سکا۔ پھر اس نے کاتنا سے کہا۔

"کاتنا! میں نے تمہاری خواہش کو پورا کر دیا ہے۔ بت پاش پاش ہو چکا ہے۔ تم نے جادوگر پجاری سے بھی بدلہ لے لیا ہے۔ اب میں واپس ملتان شہر جاؤں گا۔ تم کیا میرے ساتھ جانا چاہتی ہو؟"

کرنے کے لئے قلعے سے نکلا۔ سامنے میدان میں مسلمانوں کی فوج پہلے سے تیار کھڑی تھی۔ ناو پھونکا گیا، دَف بجائے گئے اور اللہ اکبر کے نعروں کی گونج میں مسلمان مُجاہدوں کے دو لشکر گھوڑے دوڑاتے دائیں اور بائیں جانب سے ہندو فوج کی طرف طوفان بن کر آگے بڑھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے تلواریں تلواروں سے ٹکرانے لگیں۔ مسلمانوں کی تلواریں بجلی بن کر کافروں کے سروں پر کوند رہی تھیں اور کافروں کی گردنیں کٹ کٹ کر گر رہی تھیں۔ درمیان میں سلطان محمود غزنوی خود مجاہدوں کو لے کر آگے بڑھا۔ "نعرۂ تکبیر اللہ اکبر" کی آواز بلند ہوئی اور گھمسان کی جنگ شروع ہو گئی۔ فاران پہلی بار مسلماں مجاہدوں کو اسلام کے نام پر کافروں سے جنگ کرتے، انہیں کاٹ کاٹ کر پھینکتے اور خود جامِ شہادت نوش کرتے دیکھ رہا تھا۔ ایک مسلمان شہید ہونے سے پہلے سینکڑوں کافروں کو کاٹ کر پھینک دیتا تھا۔ مسلمان مجاہد بڑی مردانگی اور بہادری سے لڑے۔ راجا جے پال کی فوج کے پانچ ہزار کافر مارے گئے اور باقی سپاہی بدحواس ہو کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ مسلمانوں کے تیروں نے ہاتھیوں کے رُخ بدل دیے اور انھوں نے اپنی ہی فوج کو روند ڈالا۔ مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی اور راجہ جے پال اپنی بیٹے آنند پال اور دو سو مُحافظ سپاہیوں کے ساتھ گرفتار ہوا۔ سلطان محمود نے شہر پر قبضہ کر کے قلعے کے اوپر اسلامی پرچم لہرا دیا۔

فاران بھی فاتح مسلمان مجاہدوں کے ساتھ شہر میں داخل ہو گیا۔ اُس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ مسلمان سپاہیوں نے فتح حاصل کرنے کے بعد کسی پر ہاتھ نہ اٹھایا۔ عورتوں، بچّوں اور بوڑھوں کو اپنی پناہ میں لے لیا اور قیدیوں کو رہا کر دیا۔ ہنُدو سلطان محمود غزنوی کے اس حُسنِ سلوک سے بے حد متاثر ہوئے۔ وہ سلطان کی حمایت میں نعرے لگانے لگے۔ سلطان محمود غزنوی نے اسی وقت اعلان کیا کہ غیر مسلموں کے ساتھ ناروا سلوک نہیں کیا جائے گا۔ اس لئے کہ اسلام ہمیں یہی سبق دیتا ہے کہ فتح کے بعد کسی پر ہاتھ نہ اُٹھایا جائے اور کسی کا مال و اسباب نہ لوٹا جائے۔ شہر کے ہنُدو تو مسلمانوں کے گرویدہ ہو گئے۔ اور کئی ہندوؤں نے بُت پرستی چھوڑ کر اسلام قبول کر لیا۔ سلطان محمود غزنوی نے راجا جے پال کے ساتھ بھی اسلامی روایات کے مطابق فراخ دلی کا سلوک کیا اور اسے اپنا مُطیع بنا کر شہر کی حکومت اس کے حوالے کر دی۔ اس کے اوپر اپنا ایک گورنر مقرّر کیا۔ فوج کا ایک حصہ رعایا کے حقوق کی حفاظت کے لئے وہاں چھوڑا اور خود غزنی کی طرف روانہ ہو گیا۔ لیکن راجا جے پال اپنی ذِلّت آمیز شکست سے سخت بددل تھا۔ چنانچہ ایک روز وہ آگ کے دہکتے ہُوئے الاؤ میں کُود گیا اور جل کر مَر گیا۔

فاران بھی سلطان محمود غزنوی کی فوج کے ساتھ ہی غزنی آ گیا۔ اسے معلوم تھا کہ سلطان محمود غزنوی کچھ عرصے بعد سومنات کو فتح کرنے آئے گا۔ اس نے تاریخ کی کتاب میں یہی پڑھا تھا کہ سومنات کا معرکہ بڑا زبردست تھا۔ فاران اس مُہم کا انتظار کر رہا تھا اور غزنی میں ہی رہا۔ وہ ایک افغان سالار کا خادمِ خاص بن گیا تھا۔ اس وجہ سے اسے سلطان کے دربار میں جانے کا موقع ملتا رہتا تھا۔ فاران نے اس بات کا مشاہدہ کیا کہ سلطان محمود غزنوی ایک مثالی مسلمان سپہ سالار ہے۔ وہ پانچوں وقت نماز ادا کرتا۔ صبح قرآن پاک کی تلاوت کرتا۔ سادہ لباس پہنتا اور سادہ غذا کھاتا۔ وہ ہر ایک کے ساتھ انصاف کرتا اور غریبوں میں خیرات تقسیم کرتا۔ ایک روز فاران اپنے آقا سالار کے ساتھ دربار میں موجود تھا کہ ایک امیر نے آگے بڑھ کر عرض کی۔

"سلطانِ مُعظّم! اللہ کے فضل و کرم سے اسلامی فوجوں نے ملک ہندوستان کے کئی کافر راجاؤں کو شکست دے کر ان کے قلعوں پر اسلام کا پرچم لہرا دیا ہے۔ مگر ابھی ہندوستان میں کُفار کا ایک بہت بڑا بُت خانہ اسلامی لشکر کا انتظار کر رہا ہے"۔

سلطان محمود غزنوی نے پوچھا "وہ کون سا بُت خانہ ہے؟ ہمیں تفصیل سے اس کے بارے میں بتایا جائے۔ کیونکہ ہم بُت شِکن ہیں۔ ہم بُتوں کو توڑ کر وہاں اسلام کا پرچم بلند کرنے کے لئے اس دنیا میں آئے ہیں"۔

امیر نے کہا "سلطانِ معظّم! ہمارے آدمیوں نے بتایا ہے کہ اس سب سے بڑے بُت خانے کا نام سومنات کا مندر ہے جو ہندوستان کی شمال مغربی گھاٹ پر سمندر کے کنارے واقع ہے۔ وہاں کے بڑے ہندو پُجاری کا کہنا ہے کہ سلطان محمود غزنوی نے دوسرے مندروں کے جن بُتوں کو توڑا ہے ان سے سومنات کا بُت ناراض تھا۔ اس لئے سومنات نے ان بتوں کی طرف داری نہیں کی ورنہ سومنات کے بُت میں اتنی طاقت ہے کہ وہ جس کو چاہے تباہ کر سکتا ہے"۔

سلطان محمود غزنوی نے یہ سنا تو اس کا چہرہ جلال سے سرخ ہو گیا۔ اس نے اپنی تلوار کھینچ لی اور کڑک کر کہا "خدا کی قسم! جب تک میں اس سومنات کے ناپاک بُت کے ٹکڑے نہیں اڑا دوں گا مجھے چین نہیں آئے گا"۔

"فوج کو تیاری کا حکم دیا جاتا ہے۔ ہم آج ہی ہندوستان کی طرف کُوچ کریں گے اور سومنات کے بت کو میں اپنے گُرز سے خود توڑوں گا اور اس کے سر کو اپنے گھوڑے کے ساتھ باندھ کر روندتا ہوا غزنی لاؤں گا"۔

فاران دربار میں ایک طرف کھڑا یہ سن رہا تھا۔ وہ دل میں خوش ہوا کہ اب وہ تاریخ کا مشہور معرکۂ سومنات اپنی آنکھوں سے دیکھ سکے گا۔ لشکرِ اسلام نے اسی وقت تیاری شروع کر دی اور صبح ہوتے ہی مسلمان مجاہدوں کی عظیم الشان فوج نے ہندوستان کی طرف کُوچ کیا۔ اس سے پہلے سلطان محمود غزنوی کئی بار ہندوستان پر چڑھائی کر چکا تھا لیکن یہ معرکہ سب سے زیادہ اہم اور مشہور تھا۔ کیونکہ سلطان نے ہندوؤں کے سب سے بڑے دیوتا اور بُت سومنات کو اپنے گُرز سے پاش پاش کرنے کی قسم کھائی تھی۔ یہ لشکرِ عظیم پہاڑوں، وادیوں اور چٹیل میدانوں سے گذرتا آخر کار ہندوستان کی سرحد پر پہنچ گیا۔

اُس زمانے میں بحیرۂ عرب کے کنارے سومنات ایک بہت بڑا شہر تھا۔ سومنات کے نام سے اس شہر میں ایک بہت بڑا مندر بھی تھا۔ جس میں سینکڑوں بت تھے مگر سومنات کا بُت ان میں سب سے بڑا تھا۔ یہ سونے کا بت تھا جس کے جسم پر قیمتی ہیرے جواہرات جڑے ہوئے تھے۔ ہندوستان کے سارے راجے مہاراجے دُور دُور سے آکر سومنات کے بت کی پوجا کرتے تھے۔ وہ سے اپنا دیوتا سمجھتے تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ سومنات کے بت کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ جو کوئی اس کو توڑنے کے لئے آئے گا، اس کی آنکھیں اندھی ہو جائیں گی اور وہ تڑپ تڑپ کر مر جائے گا۔ لیکن اسلام تو ان غلط عقیدوں کو ہمیشہ کے لئے ختم کرنے اور جھوٹے خُداؤں کے بُتوں کو توڑ کر وہاں اللہ ایک ہے کا نعرہ بلند کرنے آیا تھا۔

سومنات کے مندر کے گرد اُونچی چار دیواری تھی۔ وہاں ہر وقت ہندوؤں کی فوج پہرے پر موجود رہتی تھی۔ مندر کے اندر کوئی مسلمان داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ اگر کوئی بُھولا بھٹکا مسلمان سیّاح اندر چلا جاتا تو ہندو اسے وہیں شہید کر دیتے تھے۔ سلطان محمود غزنوی کو ان ساری باتوں کا علم تھا۔ وہ سومنات کے بُت کو اپنے ہاتھوں ٹکڑے ٹکڑے کرنے کا عزم لے کر سومنات شہر کی طرف بڑھا۔ رمضان المبارک 415 ہجری کے وسط میں سلطان محمود اپنے لشکر کے ساتھ ملتان پہنچا۔ یہاں سے آگے ایک خُشک جنگل پڑتا تھا۔ سلطان نے فوج کو حکم دیا کہ اپنے ساتھ چند دنوں کے لئے غلّہ اور پانی رکھ لیں۔ اس نے خود بھی بیس ہزار اونٹوں پر غلّہ اور پانی لادا اور آگے بڑھا۔ اِس خطرناک جنگل کو عبور کرنے کے بعد اسلامی لشکر اجمیر پہنچا۔ اجمیر کا راجا محمود غزنوی کی آمد کی خبر سن کر بھاگ گیا۔ سلطان محمود لشکر کو لے کر اجمیر سے آگے بڑھا۔ راستے میں سلطان کو کچھ اور قلعے ملے۔ ان قلعوں میں ہندو سپاہی بھی موجود تھے مگر انہوں نے قلعوں کے دروازے کھول دیے اور سلطان کے حضور ہتھیار پھینک کر اطاعت قبول کر لی۔

جب مسلمانوں کا لشکر سومنات کے قریب پہنچا تو مسلمانوں نے دیکھا کہ سومنات کی فصیل بہت ہی بلند ہے۔ ہندو سپاہی سومنات کے قلعے کی دیوار کے اوپر کھڑے ہو کر مسلمانوں کو دیکھ رہے تھے اور چلّا چلّا کر کہہ رہے تھے۔

"تم کو ہمارا سومنات تباہ کر دے گا۔ تمہیں ہمیشہ کے لئے ختم کرنے کے واسطے ہی ہمارا سومنات دیوتا تمہیں یہاں کھینچ لایا ہے"۔

سلطان محمود غزنوی نے اپنے گھوڑے پر سے سومنات کے قلعے کی دیوار کو دیکھا اور مجاہدوں سے خطاب کر کے کہا:

"کافروں کے بُت تمہاری اسلامی تلواروں کی ضربِ کاری کا انتظار کر رہے ہیں۔ اللہ اور اس کے نبیؐ پاک کے نام کا وِرد کرتے ہُوئے آگے بڑھو اور تمام ناپاک بُتوں کے ٹکڑے اڑا دو، مگر سومنات کے بُت کو میں خود اپنے گُرز سے پاش پاش کروں گا"۔

تیروں کی بوچھاڑ سے بچنے کے لئے وہ قلعے کی دیوار سے اُتر کر سومنات کے مندر میں چلے گئے اور سومنات کے بُت کے آگے سجدے کرنے اور اس سے مدد کی درخواست کرنے لگے۔ مسلمان مجاہد سیڑھیاں لگا کر قلعے کی دیوار پر چڑھ گئے اور بلند آواز سے نعرۂ تکبیر بلند کیا اس نعرے کی ہیبت سے ہندوؤں کے رہے سہے ہوش بھی گم ہو گئے۔ مسلمانوں نے قلعے کے اندر چھلانگیں لگا دیں اور کافروں کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ ہندو سپاہی کٹ کٹ کر گر رہے تھے۔ مندر کے اندر ہندو پجاری سومنات کے بت سے لپٹ لپٹ کر گڑگڑا رہے تھے۔

"اے سومنات دیوتا! ہمیں ان بت شکن مسلمانوں سے بچا لے"۔ مگر پتھر کا بُت ان کی کیا مدد کر سکتا تھا۔ جب رات کا اندھیرا چھا گیا تو اسلامی لشکر واپس اپنے خیموں میں آگیا۔

دوسرے دن سومنات کے مندر کو بچانے کے لئے دوسرے راجاؤں کی فوج بھی وہاں پہنچ گئی۔ ان ہندو لشکروں کے آجانے سے یہ خیال پیدا ہونے لگا کہ کہیں مسلمانوں کے پاؤں نہ اُکھڑ جائیں۔ کیونکہ مسلمان تعداد میں ہندو فوجیوں سے بہت کم تھے۔ اسی رات سلطان محمود غزنوی نماز پڑھنے کے بعد خدا کے حضور سجدے میں گر گئے اور بڑے ہی خلوص کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے لشکرِ اسلام کی فتح کی دعا مانگی۔ اللہ نے سلطان محمود کی دعا قبول کر لی۔ اگلے دن سلطان محمود نے سومنات پر بڑا زبردست حملہ کیا۔ دونوں راجاؤں کی فوج کے منہ پھر گئے اور وہ بھاگ کھڑی ہوئی۔ مسلمانوں نے ان کا تعاقب کر کے ایک ایک کافر کو جہنم میں پہنچا دیا۔ سلطان محمود غزنوی ایک فاتح کی حیثیت سے سومنات کے قلعے میں داخل ہوا اور سب سے پہلے قلعے پر اسلام کا پرچم لہرایا۔ اس کے بعد سلطان محمود اپنے اراکینِ سلطنت کے ساتھ سومنات کے مندر میں داخل ہوا۔ یہ بت خانہ بہت بڑا تھا۔ اس کی چھت چھپن ستونوں پر قائم تھی۔ سومنات کا بت کمرے کے درمیان میں رکھا ہوا تھا۔ اس کی لمبائی پانچ گز تھی جن میں سے ایک گز وہ زمین کے اندر دھنسا ہوا تھا۔ یہ سارے کا سارا سونے کا بُت تھا۔ اس پر قیمتی ہیرے

بت کا منہ ٹوٹ گیا۔ اس وقت برہمن پُجاری سلطان کے قدموں پر گر پڑے اور درخواست کی کہ اے سلطانِ عالی! اس بت کو نہ توڑو۔ اس کے عوض ہم تمہیں ایک لاکھ چھکڑے سونے چاندی اور جواہرات سے بھرے ہوئے دے دیتے ہیں۔ ہمارے دیوتا سومنات کے بت کو چھوڑ دو۔ اس کے جواب میں اس مسلمان سپہ سالار اور مردِ غازی سلطان محمود غزنوی نے جو بات کہی وہ تاریخ میں آج بھی محفوظ ہے اور رہتی دنیا تک محفوظ رہے گی۔ سلطان محمود نے ہندو برہمن پُجاریوں سے کہا:

"تم جو کہتے ہو اگر میں تمہارے کہنے پر چلوں تو دنیا مجھے "محمود بُت فروش" کے نام سے یاد کرے گی۔ اگر میں اس بُت کو پاش پاش کر دوں تو دنیا مجھے "محمود بت شکن" کے نام سے یاد کرے گی۔ میں تماری پیش کش کو ٹھکراتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ دنیا اور آخرت میں مجھے "محمود بت شکن" کے نام سے یاد کیا جائے۔ اس لئے میں اس بت کو پاش پاش کرتا ہوں"۔

سلطان محمود نے اللہ اکبر کا نعرہ بلند کر کے سومنات کے بت پر
دوسرا گرز مارا تو بت کا سر الگ ہو کر اس کے قدموں میں گر پڑا۔
سلطان محمود نے حکم دیا کہ سومنات کے بت کے سر کو رسیوں سے جکڑ کر میرے گھوڑے کے پیچھے باندھ دیا جائے۔ میں اس بت کے سر کو روندتا ہوا غزنی لے جاؤں گا۔ جب بت کے پیٹ کو توڑا گیا تو اس کے اندر سے ایسے قیمتی لال و جواہر نکلے کہ ان کی قیمت برہمن پجاریوں کی پیش کی ہوئی رقم سے کئی گنا زیادہ تھی۔ یہ اللہ تعالےٰ کی طرف سے سلطان محمود کو اس کی بت شکنی کا انعام تھا۔

سومنات کے بڑے بت اور اس کے ساتھ دوسرے سینکڑوں بتوں کو پاش پاش کرنے کے بعد سلطان محمود غزنوی لشکرِ اسلام کے ہمراہ واپس غزنی چلا گیا۔ فاران ابھی تک سومنات کے شہر میں ہی تھا کیونکہ سلطان وہاں اپنا ایک مسلمان صوبے دار چھوڑ گیا تھا۔ فاران نے اس مسلمان صوبے دار کی ملازمت اختیار کر لی تھی۔ سومنات کے مندر میں ٹوٹے ہوئے بتوں کے ٹکڑے وہاں سے اٹھا کر سمندر میں پھینک دیئے گئے تھے۔ برہمن پجاری دوسرے شہر کے مندروں کی طرف فرار ہو گئے تھے۔ سومنات کا مندر ویران پڑا تھا۔ جس مندر میں رات کو دس ہزار سونے کی گھنٹیوں کی آوازیں گونجا کرتی تھیں۔ اب اس مندر پر موت کا سکوت طاری تھا۔ مندر میں پانچ سو عورتیں بھجن گایا کرتی تھیں۔ وہ بھی بھاگ گئی تھیں۔

ایک رات فاران سیر کرتا ہوا سومنات کے ویران مندر میں آ گیا۔ یہاں ہر طرف اندھیرا اور ویرانی تھی۔ جہاں کبھی سومنات کا بت ہوتا تھا وہاں اب ایک گڑھا پڑا تھا۔ فاران ٹہلتا ٹہلتا مندر کے کونے کی طرف آ گیا۔ یہاں ایک پتھر کا زینہ نیچے جاتا تھا۔ فاران کو تہہ خانے کی آخری سیڑھی پر دھیمی سی روشنی دکھائی دی۔ وہ سوچنے لگا کہ مندر تو سارے کا سارا ویران ہے پھر اس تہہ خانے میں کس نے روشنی کر رکھی ہے؟ یہ سوچ کر فاران سیڑھیاں اُترنے لگا۔ وہ تیسری سیڑھی پر ہی تھا کہ اسے کسی مرد کے باتیں کرنے کی آواز سنائی دی۔ فاران وہیں رُک گیا۔ اس کو خیال آیا کہ چھپ کر دیکھنا چاہئیے کہ تہہ خانے میں یہ کون دو آدمی ہیں جو آپس میں باتیں کر رہے ہیں۔ یہ سوچ کر فاران نے دل میں اللہ کا نام دہرایا اور انگوٹھی کو چوم لیا۔ اس کے ساتھ ہی فاران نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اب وہ بڑی بے فکری سے سیڑھیاں اُتر گیا۔ کیا دیکھتا ہے کہ ایک چھوٹی

ان کے درمیان میں تانبے کی تھالی میں کڑوا تیل ہے جس میں ایک پجاری نے انگلی ڈبو رکھی ہے اور کہہ رہا ہے۔

"دھرمو! میں نے اس تیل پر سومنات دیوتا کا منتر پھونک دیا ہے۔ اب تم اس کو پی جاؤ۔ اس کے پینے سے تم پر سانپ، بچھو کے ڈسنے اور کسی طرح کے زہر کا کوئی اثر نہیں ہو گا۔ تم یہاں سے سیدھے وارانا سی شہر جاؤ۔ وہاں دریا کے گھاٹ پر جو مُردہ رات کو جلایا جائے تو صبح اس کی کھوپڑی کی راکھ اپنی آنکھوں میں لگانا۔ اس کے ساتھ ہی تمہاری آنکھوں میں اتنی روشنی آ جائے گی کہ تم اندھیرے میں بھی دیکھ سکو گے۔ دریا کے گھاٹ پر تمہیں ایک کالا سانپ ملے گا۔ وہ سومنات کی روح ہو گی۔ اسے تم اٹھا کر اپنے پاس رکھ لینا۔ اس کے بعد تم غزنی جا کر سلطان محمود کو قتل کر کے سومنات کا بدلہ لے سکو گے"۔

پُجاری دھرمو نے کہا، "ٹھیک ہے مہاراج! میں ایسا ہی کروں گا۔ میں سومنات دیوتا کی قسم کھا کر وعدہ کرتا ہوں کہ میں سلطان محمود سے سومنات کے بت کا بدلہ ضرور لوں گا"۔

یہ کہہ کر دھرمو پجاری نے تھالی والا تیل ایک ہی گھونٹ میں پی لیا۔ اس کے بعد وہ اٹھا اور بولا "اب میں وارانا سی شہر کی طرف جاتا ہوں تا کہ جلے ہوئے مردے کی کھوپڑی کی راکھ آنکھوں میں لگا کر سومنات کی روح یعنی کالے سانپ کو اپنے پاس رکھوں اور پھر سلطان محمود سے سومنات کو تباہ کرنے کا بدلہ لینے غزنی کی طرف روانہ ہو جاؤں"۔

دوسرے پجاری نے کہا "بھگوان تمہاری مدد کرے گا۔ سومنات دیوتا کی روح تمہارے ساتھ ہو گی۔ جاؤ"۔

دھرمو پجاری تہہ خانے کی سیڑھیاں چڑھ کر مندر کے ویران ہال کمرے میں آ گیا۔ فاران نے یہ سب کچھ سُن لیا تھا۔ اب بھلا وہ اس پجاری کو کیسے چھوڑ سکتا تھا۔ اس نے وہیں فیصلہ کر لیا کہ وہ دھرمو پجاری کا پیچھا کرے گا اور اگر اسے وارانا سی شہر میں دریا کنارے کالا سانپ مِل گیا تو وہ ان دونوں کو وہیں ہلاک کر ڈالے گا۔ فاران کے دل میں یہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ اگر سومنات کی روح واقعی سانپ بن کر واپس آ گئی ہے تو وہ سلطان کو نقصان پہنچا سکتی ہے۔ چنانچہ دھرمو پجاری کو مارنے کے ساتھ ساتھ کالے سانپ کا کچلنا بھی بہت ضروری ہے۔ فاران غیبی حالت میں تھا۔ وہ

دھرمو پجاری کا پیچھا کرنے لگا۔

دھرمو پجاری سیدھا سومنات شہر کی سرائے میں آگیا۔ یہاں دھرمو پجاری نے ایک گھوڑا لیا اور اس پر سوار ہو کر وارانا سی شہر کی طرف روانہ ہوگیا۔ فاران اسے کیسے اکیلا چھوڑتا۔ وہ ابھی تک غائب تھا۔ یعنی وہ خود تو سب کچھ دیکھ رہا تھا مگر اسے کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس کے لئے گھوڑا کھول کر لے جانا بڑا آسان تھا۔ اس نے دیکھا کہ سرائے کے باہر ایک گھوڑا جس پر زین کسی ہوئی تھی ایک طرف کھڑا گھاس چر رہا تھا۔ فاران بھاگ کر گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھا اور اس کو دھرمو پجاری کے گھوڑے کے پیچھے ڈال دیا۔ اب ایک عجیب بات ہوئی۔ جونہی فاران گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھا گھوڑا بھی نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ فاران پر اب یہ راز کھلا کہ غائب ہو جانے کے بعد وہ جس چیز پر بیٹھے گا وہ بھی اس کے ساتھ ہی غائب ہو جائے گی۔ فاران کو خوشی ہوئی۔ کیونکہ خالی گھوڑے کو بھاگتے دیکھ کر لوگ اس کو پکڑ سکتے تھے۔ اب فاران گھوڑے پر سوار تھا مگر گھوڑا کسی کو دِکھائی نہیں دے رہا تھا۔ صرف فاران اُسے دیکھ سکتا تھا۔

رات کے اندھیرے میں دھرمو پُجاری سومنات شہر سے نکل کر وارانا سی جانے والے شہر کی سڑک پر ہولیا۔ فاران نے بھی اپنا گھوڑا اس کے پیچھے ڈال دیا۔ اسی طرح سفر کرتے ساری رات گذر گئی۔ صبح ہوئی تو ایک جنگل میں پہنچ کر دھرمو پجاری گھوڑے سے اُترا۔ گھوڑے کو چَرنے کے لئے چھوڑ دیا اور خود درختوں کے پھل توڑ کر ایک جگہ بیٹھ کر کھانے لگا۔ یہاں ایک ندی بَہ رہی تھی۔ فاران بھی گھوڑے سے اُتر پڑا۔ وہ دھرمو پجاری سے دور درختوں کے پیچھے تھا۔ گھوڑے سے اُترتے ہی گھوڑا ظاہر ہوگیا۔ وہ ندی پر جاکر پانی پینے لگا۔ فاران کو بھی پیاس محسوس ہوئی۔ وہ بھی ندی پر آگیا اور گھوڑے سے ذرا ہٹ کر ندی میں ہاتھ ڈال کر پانی پینے لگا۔ وہ کسی کو نظر نہیں آرہا تھا۔ پانی پینے کے بعد فاران نے منہ دھویا۔ پھر اپنے ہاتھوں کو پانی سے دھونے لگا۔

اب یہ اس کی بدقسمتی تھی یا اس کی تقدیر میں ہی یہی لکھا تھا کہ جونہی اس نے اپنے ہاتھوں کو پانی میں ڈال کر ملا تو اس کی انگوٹھی اس کی انگلی سے پھسل کر ندی میں جا گری۔ انگوٹھی جونہی اُس کی انگلی سے الگ ہوئی فاران ظاہر ہوگیا اور نظر آنے لگا۔ فاران پریشان ہوگیا۔ اس کی انگوٹھی ندی میں گر چکی تھی۔ اس کو اور کچھ نہ سوجھا۔ اس نے فوراً ندی میں چھلانگ لگا دی اور ڈبکی لگا کر ندی میں انگوٹھی تلاش کرنے لگا۔ وہ بار بار ندی میں ڈبکی لگاتا تھا۔ اس نے ندی کی تہہ کی ساری ریت کو کھنگال ڈالا مگر اسے طلسمی انگوٹھی نہ مل سکی۔ اتنے میں اس نے دیکھا کہ دھرمو پجاری اپنے گھوڑے پر سوار ہوا اور وارانا سی شہر کی طرف چل دیا۔ فاران کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے؟ دھرمو پجاری کا پیچھا کرے یا طلسمی انگوٹھی کو تلاش کرے؟

(باقی اگلی قسط نمبر 5 میں)

بشکریہ اسپٹنک

کانٹے والا

محمد یونس حسرت

آپ نے مداریوں کے بندروں کو قلابازیاں لگاتے دیکھا ہو گا۔ سرکس کے بندروں کو ماہر بازی گروں کی طرح تار یا رسّی پر چلتے یا سائیکل چلاتے بھی دیکھا ہو گا اور شاید اخبارات میں ایسے بندروں کی تصویریں بھی دیکھی ہوں گی جو موٹر گاڑیوں کو ایک ماہر ڈرائیور کی طرح چلا سکتے ہیں اور چلاتے بھی ہیں۔۔۔ مگر آج ہم آپ کو ایک ایسے بندر کا حال سُناتے ہیں جو ایک عرصے تک ایک مصروف ترین ریلوے لائن پر کانٹا بدلنے والے کے اہم اور نازک ترین فرائض انجام دیتا رہا ہے۔

جی ہاں۔ کانٹے والا ریلوے کا ایک اہم ملازم سمجھا جاتا ہے اور اس کے فرائض نہایت اہم اور نازک ہوتے ہیں۔ مختلف سمتوں سے آنے والی گاڑیوں کے لئے سبز، زرد اور سُرخ جھنڈیوں اور روشنیوں کے اشارے دینا اور انہیں کانٹے بدل کر صحیح پٹڑیوں پر ڈالنا اُس کے معمول کے فرائض ہیں۔۔۔ اور ان معمول کے فرائض میں ذرا سی غفلت، ذرا سی بُھول چُوک سے ریل گاڑیاں حادثوں سے دوچار ہو سکتی ہیں۔

یہ کہانی 1877ء کی ہے جبکہ ایک حادثے میں جیمز وائلڈ نام کے ایک شخص کی ٹانگیں ضائع ہو گئی تھیں، اور وہ چلنے پھرنے سے معذور ہو گیا تھا۔ اس حادثے کے بعد جیمز وائلڈ جنوبی افریقہ میں پورٹ الزبیتھ کے نزدیک واقع یوٹن ہیج سٹیشن پر سگنل مین یعنی کانٹے والے کے طور پر ملازم ہو گیا تھا۔ اس سٹیشن کی مصروفیت اور اہمیت کا اندازہ صرف ایک اس بات ہی سے لگایا جا سکتا ہے کہ یہ جنوبی افریقہ کی پانچ بڑی بندرگاہوں اور سونے اور ہیرے کی کانوں کے عین وسط میں واقع تھا۔

اس سٹیشن کا سگنل ٹاور ریلوے لائنوں کے اس سلسلے کے ساتھ تھا جو شہروں کو قصبوں سے اور جنگلوں میں واقع چھوٹے چھوٹے دیہات سے ملاتا تھا۔ جیمز وائلڈ کی ذمّے داری یہ تھی کہ وہ مختلف سمتوں سے آنے والی گاڑیوں کو سبز، زرد اور سرخ سگنل دے کر اور کانٹے بدل کر انہیں صحیح منزلِ مقصود کی طرف لے جانے والی پٹڑیوں پر ڈالے۔ جیمز بے چارہ سٹیشن کے قریب ایک کیبن میں تنہا رہتا تھا اور اُسے نام کو بھی کوئی ایسا پڑوسی میسّر نہیں تھا جس سے وہ گھڑی دو گھڑی باتیں کر سکے۔

1881ء کے موسمِ گرما کی ایک سہ پہر کی بات ہے کہ جیمز وائلڈ مقامی مارکیٹ میں کچھ خریداری کرنے گیا۔ اپنی وھیل چیئر چلاتے ہوئے وہ ایک مقامی باشندے کے قریب سے گذرا جو اپنے سامنے پنجروں میں مختلف پرندے اور جانور لئے بیٹھا تھا۔ ایک پنجرے سے اُسے ایک بندر کا بچّہ جھانکتا نظر آیا تو وہ رُک گیا۔ وہ ایک لمحے تک اُس بندر کی چیخیں سنتا رہا جو اسے بندر کی چیخوں کی بجائے ایک بچّے کی کلکاریاں محسوس ہوتی تھیں۔ جیمز وائلڈ نے بندر کے اس

بچے کو خرید لیا اور اُس کے پنجرے کو لے کر اپنے کیبن میں واپس آگیا۔

کیبن میں آکر اس نے بندر کے بچے کو پنجرے سے نکالا اور پنجرے کو چولہے میں ڈال دیا۔ اس نے اسے گرم گرم دودھ پلایا، اسے نہلایا اور پھر اسے اپنے بازوؤں میں لے کر یوں تھپکنے لگا جیسے ایک ماں اپنے بچے کو لوریاں دیتے ہوئے سُلانے کے لئے تھپکتی ہے۔ جب وہ سو گیا تو اُس نے اسے نہایت آہستگی سے ایک نرم اور آرام دہ بستر پر لٹا دیا۔

بندر کے اس بچے نے جیمز کی زندگی ہی بدل ڈالی۔ وہ اتنا خوش پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ وہ اسے اپنے ہاتھ سے کھلاتا پلاتا تھا اور اس کی تمام ضروریات کا خیال رکھتا تھا۔ اُس نے اس کا نام جیک رکھ دیا۔ وہ پہروں جیک سے باتیں کرتا رہتا جو ہر گذرتے دن کے ساتھ ایک بندر کے بچے سے پورا بندر بنتا جا رہا تھا۔ اپنی ٹانگوں سے محرومی اب جیسے اس کے لئے کوئی مسئلہ نہیں رہی تھی۔ جیک نے اس کی زندگی سے اُداسیوں، پریشانیوں اور محرومیوں کو نکال کر اسے خوشیوں، مسرتوں اور شادمانیوں سے بھر دیا تھا۔

تاہم جیمز کو ایک پریشانی ضرور تھی۔ اُس نے پہلے روز ہی جیک کا پنجرہ چولہے میں ڈال دیا تھا۔۔۔ اب وہ سوچ رہا تھا کہ یہ بندر جنگل کا باسی ہے۔ ہو سکتا ہے اس کا جی واپس جنگل میں جانے کو چاہتا ہو۔ اس صورت میں میرا اس کو کیبن میں بند کر کے رکھنا ایک طرح کا ظلم ہو گا۔ چناں چہ ایک روز جب وہ اپنے کیبن کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو اس نے دروازہ کھلا ہی چھوڑ دیا اور اپنی وھیل چیئر چلاتا دوسری طرف دیوار کے قریب جا پہنچا۔

جیمز کی نظریں اب بندر پر جمی تھیں جو کھلے دروازے کے قریب بیٹھا تھا۔ چند لمحے وہ اسی طرح بیٹھا رہا۔ پھر اُس نے ایک جمائی لی، اُٹھا اور دروازے کی طرف بڑھا۔ جیمز کا دل جیسے اُچھل کر اس کے حلق میں آگیا۔ اب وہ مُنتظر تھا کہ دیکھیں جنگل کی آزاد زندگی اور جیمز کی دوستی اور قُربت میں سے وہ کس کا انتخاب کرتا ہے۔

جیک نے دروازہ بند کر دیا اور آکر جیمز کی گود میں لیٹ گیا اور پھر بڑے آرام سے سو گیا۔ جیمز کو اپنے سوال کا جواب مل گیا تھا اب جیک ہمیشہ کے لیے اس کا دوست اور ساتھی تھا۔

جیسے جیسے جیک بڑا ہوتا گیا، وہ جیمز کا مُختلف کاموں میں ہاتھ بٹانے لگا۔ وہ کنوئیں سے پانی نکالتا اور پانی کی بالٹیاں بھر بھر کے کیبن میں لاتا۔ جلد ہی وہ کیبن کے ساتھ والے باغ میں سبزیوں کی دیکھ بھال اور برتن وغیرہ دھونے کے کام بھی کرنے لگا۔ جیمز نے اس کی باقاعدہ تنخواہ مقرر کر رکھی تھی۔ یہ تنخواہ کیا تھی؟ ہفتے میں ایک ڈبا بسکٹوں کا اور دو چاکلیٹ۔ جیک کو ٹافیوں کا بھی بڑا شوق تھا۔ ٹافی مُنہ میں ڈال کر وہ اسے دیر تک اپنے جبڑوں کے درمیان گھماتا اور گھلاتا رہتا تھا۔

سگنل ٹاور میں جیک نے کئی طریقوں سے جیمز کی مدد کرنا شروع کی۔ وہ جھاڑو سے ساری جگہ کی صفائی کرتا اور کھڑکیوں کے شیشوں کو گیلے کپڑے سے صاف کرتا۔ دیوار کی ایک کھونٹی پر ایک خاص چابی لٹکی رہتی تھی۔ یہ چابی دُور جانے والی ریل گاڑیوں کے ڈرائیوروں کو دی جاتی تھی۔ جب جیک گاڑی آنے کی آواز سنتا تو وہ کھونٹی سے چابی اُتارتا اور ریلوے لائن کے قریب کھڑا ہو جاتا۔ ریل گاڑیاں سگنل ٹاور کے پاس سے گزرتے ہوئے آہستہ ہو جاتی ہیں۔ جیک لپک کر انجن پر چڑھ جاتا، ڈرائیور کو چابی تھماتا اور پھر چھلانگ لگا کر نیچے آجاتا۔ ٹرین کی واپسی پر وہ اسی طرح چابی واپس حاصل کرتا اور اسے دوبارہ کھونٹی پر لٹکا دیتا۔

پھر جیک نے سگنل کی جھنڈیوں اور روشنیوں کا استعمال بھی سیکھ لیا۔ پھر تو یہ کیفیت ہو گئی کہ جیمز جس جھنڈی کا نام لیتا، جیک وہی جھنڈی اٹھاتا اور سگنل ٹاور کی کھڑکی سے لہرانے لگتا۔

پھر جیمز نے اس بندر کو کانٹا بدلنے کا کام سکھانے کا فیصلہ کیا۔ جیک کی روشن اور چمکتی ہوئی آنکھیں جیمز کو لمبے اور بھاری بھرکم لیوروں کے ذریعے ریل کی پٹڑیوں کے کانٹے بدلتے غور سے دیکھتی رہتی تھیں۔ جیمز نے ہر لیور کو ایک نمبر دے رکھا تھا۔ وہ ہر نمبر کو پہلے زبان سے کئی کئی بار دُہراتا اور پھر اس نمبر کے لیور کو ہاتھ لگاتا۔ اس کام میں اُسے ہر روز کئی کئی گھنٹے لگ جاتے مگر آخر کار اس کی محنت اور تربیت سے جیک اس قابل ہو گیا کہ ہر مرتبہ صحیح لیور کو کام میں لا سکے۔

جیمز اس بارے میں جیک کا ایک بار نہیں کئی کئی بار امتحان لیتا تھا۔ ہفتوں کی محنت اور تربیت کے بعد کہیں جا کر جیک اس قابل ہوا کہ جیمز کے حسبِ منشا کانٹا بدلنے کا کام کر سکے۔ شروع شروع میں جیمز نے اس سے سُست رفتار مال گاڑیوں کے کانٹے بدلوانے

کا کام لیا اور جب جیک اس کام کو روانی، اعتماد اور درستی کے ساتھ کرنے لگا تو جیمز جیز رفتار گاڑیوں کے کانٹے بدلوانے کا کام بھی اس سے لینے لگا۔

جب کسی مسافر گاڑی کے کانٹا بدلنے کا وقت آتا تو جیمز کو یہ پریشانی ضرور ہوتی تھی کہ جیک کانٹا بدلنے میں کوئی غلطی نہ کر بیٹھے اور اس کی غلطی سے گاڑی کسی حادثے کا شکار نہ ہو جائے۔ اگرچہ اسے جیک پر پُورا اعتماد اور بھروسا تھا مگر یہ ایک بھاری ذمے داری تھی۔ ذرا سی غفلت سے مسافروں کو نقصان پہنچ سکتا تھا۔ پھر بھی اس نے خاصے غور و فکر کے بعد جیک کی صلاحیتوں پر اعتماد کرنے کا فیصلہ کیا۔

"جیک، سُرخ جھنڈی!"

"زرد جھنڈی! تین نمبر کھینچو!"

جیمز کے ان احکام کی تعمیل جیک نے ایک ماہرانہ انداز میں کی۔

"سبز جھنڈی، جیک!"

جیک نے اس کے حکم کے مُطابق سبز جھنڈی دکھائی اور مسافروں سے لدی پھندی گاڑی اپنی پٹڑی بدلنے کے بعد تیزی سے منزلِ مقصود کی طرف روانہ ہو گئی۔

یہ پہلا موقع تھا جب جیک نے جیمز کے حکم کے مطابق کسی مسافر گاڑی کے لیے درست طور پر کانٹا بدلا اور گاڑی کسی حادثے سے محفوظ رہی۔ اس کے بعد جیک نے یہ کام سینکڑوں بلکہ ہزاروں مرتبہ کیا اور ہر بار بالکل ٹھیک ٹھاک کیا۔ آہستہ آہستہ وہ اس کام میں اتنا ماہر ہو گیا کہ جیمز کے سگنل ٹاور میں موجود نہ ہونے پر بھی سارے کام کو اپنے طور پر انجام دے سکتا تھا۔ جیمز اپنے کیبن میں آرام کر رہا ہوتا اور جیک سگنل ٹاور میں گاڑیوں کو سُرخ، زرد اور سبز جھنڈیاں دکھا رہا ہوتا اور کانٹے بدل کر انہیں اپنی اپنی منزل مقصود کی طرف لے جانے والی پٹڑیوں پر ڈال رہا ہوتا۔

1881ء سے 1890ء تک پُورے نو سال جیک جیمز کا اس کام میں ہاتھ بٹاتا رہا۔ پورے نو سال تک جیمز اور جیک کی یہ رفاقت قائم رہی اور اس وقت ختم ہوئی جب ایک موذی مرض کا شکار ہو کر جیک اس دُنیا سے رُخصت ہو گیا۔

آج جیک اور جیمز دونوں میں سے کوئی بھی اس دُنیا میں نہیں۔ ریل گاڑیوں کے سفر میں بھی طرح طرح کی تبدیلیاں اور ترقیاں ہو چکی ہیں۔ مگر جنوبی افریقہ کی پانچ بڑی بندر گاہوں اور سونے اور ہیرے کی کانوں کے عین وسط میں واقع یوٹن ہیج ریلوے سٹیشن کے لوگ اب بھی جیک نامی اس بندر کی کہانی بڑی دِل چسپی سے کہتے اور سُنتے ہیں جو اس مصروف ترین ریلوے لائن پر کانٹا بدلنے کے اہم اور نازک ترین کام کو بغیر کسی حادثے کے ایک نہ دو، پُورے نو سال تک انجام دیتا رہا تھا۔

بے وقوف لومڑ

اطہر مسعود

بہار کا ایک خُوبصورت دِن تھا۔ ایک لومڑ اور لومڑی کھیت کے کنارے سے گُزر رہے تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ ایک بوڑھا آدمی درخت کے نیچے بیٹھا بچّوں سے باتیں کر رہا تھا۔ چلتے چلتے جونہی آواز لومڑ کے کانوں میں پڑی، وہ فوراً رُک گیا۔ لومڑی نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔ اِس سے پہلے کہ وہ اُس سے کچھ پوچھتی، لومڑ آہستہ سے بولا: "میں نے بوڑھے کی باتوں میں "لومڑ" کا لفظ سُنا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے وہ بچّوں کو کوئی کہانی سُنا رہا ہے۔ یہ کہانی مزے دار ہوگی۔ آؤ ہم بھی سُنیں"۔

وہ دونوں بوڑھے کی آواز پر کان لگا کر ایک کونے میں دبک کر بیٹھ گئے۔ بڑے میاں بچّوں کو بتا رہے تھے کہ ایک کوّے نے بڑی مشکل سے پنیر کا ایک ٹکڑا حاصل کیا اور ایک درخت پر بیٹھ کر کھانے ہی والا تھا کہ کہیں سے ایک لومڑی نمودار ہوئی۔ اس نے بڑی ترکیب سے وہ ٹکڑا کوّے سے چھین لیا۔ کہانی ختم ہوئی تو وہ سب بچّے کھیل کُود میں مشغول ہو گئے۔ مگر لومڑ اور لومڑیا وہیں کھڑے ایک دوسرے کو تکتے رہے۔ تھوڑی دیر بعد لومڑ نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور کہنے لگا: "لومڑوں کی چالاکی کی بڑی تعریفیں سُنی ہیں۔ میں بھلا کیوں نہ اپنی اس خصوصیّت سے فائدہ اٹھاؤں"؟

لومڑی کہنے لگی: "آدمیوں کی تو عادت ہوتی ہے کہ اکثر چیزوں کو بڑھا چڑھا کر بیان کرتے ہیں۔ ٹھیک ہے لومڑ بھی عقلمند قوم ہے مگر اتنی بھی نہیں کہ جتنا لوگوں نے مشہور کر رکھا ہے"۔

لیکن اس وقت تو لومڑ پر کہانی کا بُھوت سوار تھا۔ سو وہ غُصّے میں بولا: "بس بس زیادہ باتیں نہ بناؤ۔ تم ہمیشہ اسی طرح میرا راستہ روک لیتی ہو۔ میں بھی کہانی والے لومڑ کی طرح عقلمند اور چالاک ہوں"۔

لومڑی نے ایک دفعہ پھر اسے سمجھانے کی کوشش کی: "دیکھو مُجھے تمہاری صلاحیتوں پر پورا پورا بھروسہ ہے لیکن بہتر یہی ہے کہ تم اپنے کام سے کام رکھو اور کہانیوں پر زیادہ یقین نہ کرو"۔

لومڑ پر اِس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ اور وہ دونوں اپنے گھر کی طرف چل پڑے۔

ایک دن لومڑ خوشی سے اُچھلا اور بولا "آہا۔ وہ مارا۔۔۔

لومڑی نے فوراً پوچھا: "آخر کیا ہو گیا ہے جو اتنے خُوش ہو رہے ہو"؟

لومڑ کہنے لگا: "بس دیکھتی جاؤ۔ ایک ایسی ترکیب ڈھونڈ نکالی ہے کہ ہم تھوڑے ہی دنوں میں بہت سے مُرغوں کے مالک بن جائیں گے۔ یوں سمجھو کہ ہمارے سارے دُکھ درد دور ہو گئے۔ اب تو باقی زندگی مُرغوں کے درمیان ہی گزرے گی"۔

لومڑی پہلے تو بڑی خُوش ہوئی، لیکن ساتھ ہی کہنے لگی: "پھر بھی بہتر یہی ہے کہ تم اپنی جان خطرے میں نہ ڈالو"۔

اگلے دن صُبح صُبح لومڑ نے اپنے چچا کے گھر کی راہ لی۔ سارا راستہ

ڈربے کے دروازے پر پہنچ گیا۔ ڈربے کا ادھ کھلا دروازہ دیکھ کر تو اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ ہی نہ رہا۔ اب لومڑ اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد بڑے آرام سے ڈربے میں داخل ہوا اور مُرغوں کی آواز میں ہی کٹ کٹ کرنے لگا۔

ڈربے میں موجود مُرغوں نے آج تک ایسی عجیب مخلوق نہیں دیکھی تھی۔ انہوں نے فوراً شور مچانا شورع کر دیا۔ لومڑ بولا: "پیارے مُرغو! میری بات غور سے سنو۔ باہر بہت پیارا موسم ہے۔ مجھے دیکھو میں نے وہاں کی تازہ ہوا میں کچھ ہی سانس لیے ہیں اور اتنا بڑا ہو گیا ہوں۔ آؤ میرے ساتھ آج سب مِل کر پکنک منائیں"۔

اب لومڑ ڈربے کا دروازہ کُھلا چھوڑ کر باہر آ گیا تاکہ سب مُرغ بھی باہر آ جائیں۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی اپنی جگہ سے نہ ہلا۔

لومڑ دل ہی دل میں بولا: "لعنت ہو ایسے ڈھیٹ مُرغوں پر۔ لومڑ دوبارا ڈربے میں داخل ہوا اور بڑے پیار سے مرغوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہنے لگا: "یہاں تو زندگی گزارنا خود کو بیمار کرنے کے برابر ہے۔ اپنی طرف دیکھو تو سہی۔ تم سب کتنے کمزور اور بیمار دکھائی دیتے ہو۔ میں تمہاری مدد کو آیا ہوں۔ لہٰذا خاموشی سے میرے پیچھے پیچھے چلتے آؤ"۔

پس وہ ڈربے کے دروازے کے سامنے کھڑا ہو کر کہنے لگا "پیارے مُرغو! سُستی اور کاہلی چھوڑو۔ اس ڈربے سے باہر آ[illegible] بہت آسان ہے۔ میں تمہارے پیچھے پیچھے چلوں گا اور تم میرے آگے آگے دیکھو اس طرح۔۔۔۔"

اس نے ایک قدم آگے بڑھایا۔ اب دوسرے قدم کی باری تھی لیکن لومڑ نے محسوس کیا کہ جیسے کوئی اُس کے پیچھے کھڑا ہے۔

اس نے اپنا سر گھمایا تو دیکھا کہ وہی ننھی سی لڑکی ایک مرد کے ساتھ وہاں کھڑی تھی۔ لومڑ تو اس آدمی کی انگارہ بھری آنکھوں کو دیکھتے ہی جیسے زمین میں گڑ گیا اور تھوڑی دیر بعد وہاں سے بھاگ نکلا۔ مُرغ زور زور سے چلّا رہے تھے اور گھر کا مالک غصّے سے لومڑ کا پیچھا کر رہا تھا۔ بالآخر مالک نے ایک لکڑی اٹھائی اور پوری قوت سے لومڑ کی طرف دے ماری جو اس کے دُم پر لگی اور وہ روتا ہوا ایک درخت کے پیچھے چُھپ گیا۔ اس کی سب تراکیب ناکام ہو گئیں تھیں اور سب سے بڑی پریشانی اسے یہ تھی کہ اب لومڑی کو کیا مُنہ دکھائے گا۔

آخر کار وہ گرتا پڑتا روتا دھوتا اپنے گھر کو ہو لیا۔ گھر پہنچا تو لومڑی وہاں ٹہل رہی تھی۔ جب اس نے لومڑ کو زخمی حالت میں خالی ہاتھ دیکھا تو اس کی طرف بھاگی اور کہنے لگی: "کاش تم پہلے ہی مان لیتے کہ کہانیاں فرضی ہوتی ہیں تو آج اس تکلیف میں مبتلا نہ ہوتے۔

اونچی آواز سے گاتا چچا کے گھر جا پہنچا اور دیکھا کہ چچا دھوپ سینک رہا ہے۔ لومڑ نے اُسے بڑے ادب سے سلام کیا اور ایک طرف ہو کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد لومڑ چچا نے اپنی آنکھیں کھولیں اور اس سے پوچھا: "کیوں بھئی۔ آج ہماری یاد کیسے آگئی"؟

لومڑ ادب سے سر جُھکا کر بولا: "پہلی وجہ تو یہ ہے کہ آپ سے ملنے کو جی چاہ رہا تھا اور دوسرے یہ کہ کچھ کام بھی تھا"۔

لومڑ چچا نے طنزیہ انداز میں ہنستے ہوئے کہا: "خیر پہلی بات تو سراسر جھوٹ ہے، دوسری بتاؤ۔ لومڑ شرمندگی سے بولا: "چچا جان! آپ کو یاد ہوگا چند سال پہلے جب آپ خُوب جوان ہوا کرتے تھے تو آپ نے کہیں سے مُرغ کے پروں سے بھرا ہوا ایک تکیہ چرایا تھا"۔

لومڑ چچا پہلے تو کِھکھلا کے ہنسا۔ پھر کہنے لگا: "ہاں ہاں میرے پاس وہ تکیہ آج بھی موجود ہے۔

لومڑ دل ہی دل میں خُوش ہوا اور بولا: "اچھے چچا جان! اگر ہو سکے تو وہ تکیہ چند دنوں کے لئے مجھے بطور قرض دے دیجئے۔ میں وعدہ کرتا ہوں جان سے بڑھ کر اِس کی حفاظت کروں گا۔

لومڑ چچا نے چند لمحے کے لئے سوچا اور کہنے لگا: "وہ تکیہ گھر کے فُلاں کونے میں پڑا ہے، لے لو۔ لیکن چند دنوں بعد یاد سے واپس کر دینا"۔

لومڑ چچا نے تو ساتھ ہی آنکھیں موند لیں اور سو گیا۔ لومڑ نے بھی چھلانگ لگائی اور تکیہ لے کر یہ جا وہ جا۔ گھر پہنچا تو لومڑی اِس کے انتظار میں کھڑی تھی۔

تھوڑی دیر ستانے کے بعد وہ دونوں جنگل کے سب سے گھنے حصے کی طرف روانہ ہوئے۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ اپنی منزل مقصود پر پہنچے تو لومڑ بولا: "ان درختوں کو اپنے دانتوں سے اس قدر چھیلو کہ اِن کی چھال اُتر جائے اور لیس دار مادہ نکلنے لگے"۔

لومڑی نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا۔

لومڑ بولا: "بی لومڑی! اپنے دانتوں کی فِکر نہ کرو۔ اللہ نے چاہا تو ہم ایسے موٹے موٹے مُرغ پکڑیں گے کہ جن کا گوشت شہد کی طرح ہمارے منہ میں گھل جائے گا۔ لہٰذا اب جتنا بھی ہو سکے، اپنے دانتوں سے فائدہ اٹھاؤ"۔

اس کے بعد انہوں نے ایک درخت چُنا اور اسے چھیلنے میں مشغول ہو گئے۔ لومڑی بھی مجبوراً لومڑ کا ساتھ دینے لگی۔ لیکن جب تھوڑی دیر بعد لیس دار مادہ درخت کے تنے سے باہر نکلنا شروع ہوا تو لومڑی کو لومڑ کی عقل کی داد دینا پڑی۔ چند گھنٹوں کی لگاتار محنت کے بعد اِن دونوں نے اپنی ضرورت کے مطابق کافی لیس دار مادہ جمع کر لیا۔ اب لومڑ نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر تکیے کو پھاڑا جس سے سفید اور سُرخ بہت سے پَر زمین پر بکھر گئے۔ اس وقت تو وہ اتنا خوش تھا کہ اسے اپنے چچا سے کیا ہوا وعدہ بھی یاد نہ رہا۔ وہ خُوشی خُوشی لیس دار مادہ والی زمین پر لیٹ گیا اور جب وہ مادہ اُس کی پشت پر اچھی طرح لگ گیا تو لومڑ ان چھیلے ہوئے پروں پر لوٹنیاں لینے لگا۔ جس سے وہ سارے پر اس کے جسم پر چپک گئے۔ اب وہ ایک مُرغ کی طرح نظر آنے لگا۔ لومڑی مسلسل حرکات کا جائزہ لے رہی تھی، ایک دفعہ تو وہ اس کو دیکھ کر ہنس ہی پڑی۔

لومڑ اپنے پروں پر مغرور ہوتے ہوئے بولا: "ہنس کیوں رہی ہو! اسے کہتے ہیں عقل مندی۔ اب جب مُرغ میرے پروں کو دیکھیں گے تو میرے پیچھے پیچھے چلے آئیں گے۔ اور میں انہیں اسی طرح اپنے گھر کی طرف کھینچ لاؤں گا۔۔۔ اچھا بی لومڑی خُدا حافظ۔ تم اب گھر چلو، وہیں ملاقات ہوگی"۔

اس کے بعد لومڑ مُرغوں کے ڈربے کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہاں پہنچا تو دیکھا کہ ایک چھوٹی سی بچّی ڈربے کے قریب بیٹھی کوئی گیت گا رہی تھی۔ لومڑ ایک درخت کے پیچھے چُھپ گیا اور دُعا

ہم بچے پاکستانی

حفیظ الرحمٰن احسن

ہم بچے پاکستانی
ہم بچے پاکستانی

ہم بندے ایک خدا کے
جو پالنے والا سب کا
جو ہے رکھوالا سب کا

جھکتی ہے اسی کے آگے
سب لوگوں کی پیشانی
ہم بچے پاکستانی
ہم بچے پاکستانی

ہم اُمت ایک نبیؐ کی
جو سب پر رحمت والے
اُمت پر شفقت والے

کیا شان ہے اُن کی اُونچی
کب کوئی اُن کا ثانی
ہم بچے پاکستانی
ہم بچے پاکستانی

ہم پاکستان کے شہری
آزادی کے رکھوالے
سچائی کے متوالے

ہم قوت پاک وطن کی
ہم سب کی ایک کہانی
ہم بچے پاکستانی
ہم بچے پاکستانی

مکان نمبر 355 گولی مار نمبر 1
کراچی نمبر 18

شفیق الرحمان 14 سال
کرکٹ ، مطالعہ
محلہ فرید ٹاؤن
گوجرانوالہ

کاشف احمد 12 سال
مطالعہ ، ٹکٹ جمع کرنا
محلہ سلطان پورہ چکلالہ روڈ
راولپنڈی

اشفاق احمد راں 13 سال
کیرم ، بیڈمنٹن
شاہین لائبریری
عمر فاروق روڈ بھکر

پیر سجاد بودلہ 12 سال
ٹکٹ جمع کرنا ، قلمی دوستی ۔
معرفت بودلہ دواخانہ کالج روڈ
بورے والا ضلع وہاڑی

نثار محمود چوہدری 14 سال
کرکٹ ۔
مکان نمبر 10 سیکٹر سی گلی نمبر 1
انتر کالونی کورنگی روڈ کراچی 46

محمد اعجاز 13 سال
کرکٹ ، ٹکٹ جمع کرنا
مکان نمبر 95 نزد گورنمنٹ
گرلز ہائی سکول حافظ آباد

کرکٹ ، قلمی دوستی
کوٹھی نمبر 118 ، سلطان کالونی
فاطمہ ہسپتال کالج روڈ سرگودھا

سید عاصم منور 15 سال
ٹکٹیں اور تاریخی تصاویر جمع کرنا ۔
مکان نمبر 122 گلشن اقبال
کالونی ہارون آباد ۔

محمد فاروق زاہد 14 سال
کرکٹ
چک نمبر 125 ۔ پی ضلع
رحیم یار خان

فہد حمید 14 سال
کرکٹ ، ٹکٹیں جمع کرنا
443 ۔ نشتر بلاک ، علامہ
اقبال ٹاؤن لاہور ۔

رفاقت سربلند سرور 8 سال
کرکٹ ، مطالعہ ، کارٹون بنانا
گلی نمبر 4 مکان نمبر 3 محلہ برکت پورہ
شالامار ٹاؤن باغبانپورہ لاہور ۔

محمد رضوان 16 سال
ہاکی ، مطالعہ
ڈاکٹر صالح حیدر ، جہانگیر کالونی
حالی روڈ حیدر آباد سندھ

محمد سلیم 13 سال
کرکٹ ، قلمی دوستی
10-H/702 پی ۔ اے
ایف واہ کینٹ ۔

آئیے دوست بنائیں

اگست : 1989

قلمی دوستی کی اس محفل میں شریک ہونے کے لیے یہ کوپن پُر کرنا اور تصویر بھیجنا ضروری ہے۔
(لڑکیاں اس میں حصہ نہیں لے سکتیں ۔)

نام ________ عمر ________

مشاغل ________

پتا ________

داؤدی علمی آزمائش

کس تاریخ کو لارڈ مونٹ بیٹن نے ہندوستان کی تقسیم کا اعلان

تھا۔

برطانوی وزیر اعظم نے کب اعلان کیا تھا کہ ہندوستان کو آزاد کر

دے گا۔

— مسلم لیگ نے کس تاریخ کو یوم فتح منایا تھا۔

— مسلم لیگ کا تاریخی اجلاسِ دہلی کب منعقد ہوا تھا۔

— کرپس مشن کب ہندوستان میں آیا تھا۔

— بلوچستان نے کس ماہ اور سن میں پاکستان میں شریک ہونے کا

اعلان کیا تھا۔

— مولانا ابو الکلام آزاد کی جگہ پنڈت جواہر لال نہرو کب کانگرس کے

صدر بنے تھے۔

— ہندوستان میں عبوری حکومت کے قیام کا سرکاری اعلان کب

ہوا تھا۔

9 – 1940ء میں قائداعظم جب لاہور آئے تو ان کا جلوس کن کن

بازاروں سے گزرا تھا۔

10 – اس شعر کا پہلا مصرعہ تلاش کر کے شعر مکمل کیجئے۔

سکھائے کس نے اسماعیل کو آدابِ فرزندی

11 – بتائیں مندرجہ بالا شعر کس کا ہے؟

12 – یہ بتائیے کہ قرارداد پاکستان انگریزی زبان میں تھی اس کا اردو

ترجمہ کس نے کیا تھا۔

13 – علامہ عنایت اللہ مشرقی کہاں کے رہنے والے تھے اور ان کی قبر

کہاں ہے۔

14 – 1940ء میں پنجاب کا وزیر اعظم کون تھا۔

15 – حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کیوں اپنے بیٹے حضرت اسماعیل

کو ذبح کرنا چاہا تھا۔ یہ قربانی کس مقام پر ہوئی؟

انعام پانے والے کامیاب دوست ماہ جولائی 1989ء

اس ماہ بے شمار بچوں نے دُرست جوابات بھیجے ہیں۔ بذریعہ قرعہ

اندازی حسب ذیل بچے انعام کے حق دار قرار پائے۔

پہلا انعام 100 کی کتابیں۔

فیصل مسعود، مکان نمبر B/1100 فیملی کوارٹرز، مارکیٹ روڈ نواب شاہ سندھ۔

دوسرا انعام 75 روپے کی کتابیں۔

شیخ شیراز احمد، ای۔ 94۔ اے سٹلائیٹ ٹاؤن راولپنڈی۔

تیسرا انعام 50 روپے کی کتابیں۔

محمد نعیم مجید، معرفت عبدالمجید میجر۔ 16 بزنسمین کالونی رحیم یار خان۔

حسب ذیل بچوں کو 25،25 روپے کی کتابیں دی گئی ہیں:

1. انیتا جیون عل، گوجرانوالہ۔
2. اللہ دتہ عطیل، ضلع خانیوال۔
3. نعمان طاہر فاروقی، شادمان لاہور۔
4. فرحانہ افتخار، حیدر آباد۔
5. فائزہ کنول، بہاولپور۔
6. عدیل ارشد، سمن آباد لاہور۔
7. اویس حیدر، فضل پورہ لاہور۔
8. محمد عامر شہزاد، گلبرگ III لاہور۔
9. سعدیہ مشتاق، میاں میر لاہور۔
10. فاطمہ ضیاء زیدی، بہاولپور۔
11. مسعود سرور گوندل، ملتان
12. شاہدہ کوثر، اسلام آباد۔
13. کاشف قدیر، خانیوال۔
14. نبیل شاہین، سیالکوٹ۔
15. علی عمران پرنس، پتوکی۔
16. نادر شاہین، سیالکوٹ۔
17. محمد طارق احمد لاہور۔
18. صدف شہزادی، لاہور۔
19. اعجاز الرحمن، ماڈل ٹاؤن لاہور۔
20. محمد عمران محبوب، ساہیوال۔
21. علی حیدر، اسلام آباد۔
22. حمیرا جمیل، بہاولنگر۔
23. طارق جاوید رانا، باٹا پور لاہور۔
24. غلام حسین میمن، حیدر آباد۔
25. سلیمان بختی، باغبانپورہ لاہور۔
26. رفعت خان، کلور کوٹ۔
27. مہدی حسن، بھکر۔
28. کنول امبر، سمن آباد لاہور۔
29. عائشہ اسلام، سیالکوٹ۔
30. انجم شہزاد، میرپور آزاد کشمیر۔
31. ایاز قیصر، ماڈل ٹاؤن لاہور۔

دماغ لڑاؤ

ہر حل کے ساتھ اس کوپن کا

بھیجنا ضروری ہے۔ آخری تاریخ 10 اگست ہے۔

نام ________ عمر ________

پتا ________

آنٹی مونیکا

رُتھ پارک
سعید لخت

ہماری خالاؤں میں آنٹی مونیکا سب سے بڑی اور سب سے اچھی خالہ تھیں۔ دُبلا پتلا چھریرا بدن، چاندی کے سے بال اور گہری جھیل جیسی نیلی آنکھیں۔ خُدا بخشے بڑی ہنس مُکھ اور خوش اخلاق خاتون تھیں۔ جو اُن سے ایک بار مِل لیتا، بس اُنھی کا ہو جاتا۔

ویسے تو آنٹی کا سارا ناک نقشہ ہی خُوبصورت تھا، لیکن ناک خاص کر بہت من موہنی تھی۔ بد قسمتی سے یہ ناک کرسمس کی ایک شام زخمی ہو گئی اور اِسی زخمی ناک نے اِس کہانی کو جنم دیا جو میں آپ کو سُنانے لگی ہُوں۔

یہ پچاس سال پہلے کا قِصّہ ہے۔ آنٹی مونیکا کرسمس کی شام کو تُحفے تحائف خرید کر واپس آ رہی تھیں کہ بس سے اُترتے وقت اوندھے منھ سڑک پر گر پڑیں اور اُن کی ننّھی مُنّی ناک زخمی ہو گئی۔ نیک دِل راہ گیر اُنہیں اُٹھا کر ہسپتال لے گئے جہاں ناک پر، دوا میں بِھیگا ہُوا پھاہا رکھ کر، پٹّی باندھ دی گئی۔ اِس کے بعد انہیں ٹیکسی میں بٹھا کر گھر پہنچا دیا گیا۔

گھر میں گُھپ اندھیرا تھا۔ آنٹی مونیکا کی بہنیں بازار سے واپس نہیں آئی تھیں اور اُن کی والدہ، یعنی میری نانی، گِرجا گھر گئی ہُوئی تھیں۔ آنٹی مونیکا نے اپنے کمرے میں جا کر آئینے میں چہرہ دیکھا تو بُہت گھبرائیں۔ آنکھوں کے گِرد سیاہ حلقے پڑے ہوئے تھے، پُوری ناک اور آدھا چہرہ پٹّی میں لِپٹا ہُوا تھا، بکھرے ہوئے بال مٹّی میں اٹے ہُوئے تھے، اور سب سے بڑی بات یہ کہ ناک سے ابھی تک خُون رِس رہا تھا جس سے ساری پٹّی سُرخ ہو گئی تھی۔ اس حالت میں وُہ سچ مچ کی چُڑیل لگ رہی تھیں۔

وُہ گھبرا کر آئینے کے سامنے سے ہٹ گئیں اور سوچنے لگیں کہ ماں اور بہنوں نے مجھے اِس حالت میں دیکھ لیا تو اُن کا کیا حال ہو گا۔ وُہ یہ سوچ ہی رہی تھیں کہ برابر والے کمرے میں کسی کے قدموں کی چاپ سُنائی دی۔ وُہ سمجھیں کہ ماں گرجا گھر سے واپس آ گئی ہیں۔ اُنھیں اور کچھ تو سُوجھا نہیں، جھٹ کپڑوں کی الماری میں گُھس گئیں اور دروازہ بند کر لیا۔

اب قدموں کی چاپ آنٹی مونیکا کے کمرے کے دروازے پر سُنائی دے رہی تھی۔ چند لمحوں بعد کمرے کا دروازہ کُھلا اور کوئی اندر داخل ہوا۔ آنٹی نے الماری کی جِھری سے آنکھ لگا کر باہر جھانکا تو اوپر کی سانس اوپر نیچے کی نیچے رہ گئی۔ دروازے میں ڈراؤنی شکل کا ایک شخص کھڑا تھا اور اُس کے ہاتھ میں ٹارچ تھی۔ وہ دبے پاؤں اندر آیا، اِحتیاط سے اِدھر اُدھر دیکھا، ٹارچ جلا کر اُس کی روشنی سِنگھار میز پر ڈالی اور پھر چند ہی لمحوں میں آنٹی کا پاؤڈر کا ڈبّا، چاندی کے دستے والا بالوں کا برش، سونے کی چین والی گھڑی اور سونے کی چوڑیاں اُس کی جیبوں نے ہڑپ کر لیں۔ اِس کے بعد وُہ جلدی سے مُڑا اور بھد بھد کرتا ہُوا کپڑوں کی الماری کی طرف آیا۔ آنٹی مونیکا نے آنکھیں بند کر لیں، سانس روک لی اور تن کر کھڑی ہو گئیں۔

اُسی وقت الماری کا دروازہ کُھلا اور چور نے ٹارچ کی روشنی اندر ڈالی۔ اب یہ اُس کی بد قسمتی کہ روشنی سیدھی آنٹی مونیکا کے چہرے پر پڑی۔ چور نے دِل ہلا دینے والی چیخ ماری اور دھڑام سے فرش پر گر پڑا۔

عین اُسی لمحے آنٹی مونیکا کی ماں، بہنیں اور اُن کے بچّے بھاگتے دوڑتے، قہقہے لگاتے مکان میں داخل ہوئے۔

کرسمس کی اُس رات کا باقی حِصّہ پولیس کو فون کرنے، پولیس کے آنے، آنٹی مونیکا کا بیان لکھنے، اور پولیس کے جانے کے بعد آنٹی کی کہانی سُننے میں گُزر گیا اور اس طرح وہ خُوشیوں بھری رات غارت ہو گئی۔ اُس غریب چور نے بھی اُس سال کرسمس کا تہوار حوالات میں منایا۔ لیکن اُسے یہ جان کر خُوشی ہو گی کہ وُہ اُس دن سے ہماری کرسمس کی تقریبات کا ایک حِصّہ بن گیا ہے۔ اِس واقعے کو پچاس سال گزر گئے ہیں لیکن ہم اب بھی ہر کرسمس کو اُس کی یاد تازہ کرتے ہیں اور اپنے مرحوم بُزرگوں کے ساتھ اس کے حق میں بھی دُعائے خیر کرتے ہیں۔

انسان کے جسم پر بال کیوں ہوتے ہیں؟

پرندوں کے پَر ہوتے ہیں اور دُودھ پلانے والے جانوروں اور اِنسانوں کے جسم پر بال۔ خیال کیا جاتا ہے کہ اِن پَروں اور بالوں نے پَرندوں اور اِنسانوں کو رینگنے والے جانوروں سے بُہت مختلف کر دیا ہے۔

اِنسانی جسم میں ہاتھ کی ہتھیلی اور پاؤں کے تلوے کے علاوہ پورے جسم پر بال ہوتے ہیں قدیم انسان کے جسم پر بال ہمارے بالوں سے کہیں زیادہ ہوتے تھے۔ یہ بال اُن کو موسموں کی شدت سے محفوظ رکھتے تھے۔

بالوں کی نشوونما جنسی غددوں سے ہوتی ہے۔ مردوں میں ایک خاص قسم کے ہارمونز ہوتے ہیں جو چہرے اور جسم کے بالوں کی نشوونما کرتے ہیں اور سر کے بالوں کی نشوونما کو ایک حد تک رکھتے ہیں۔ عورتوں میں یہ ہارمونز اُلٹ کام انجام دیتے ہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہمیں اِن بالوں کی کیوں ضرورت ہو
ہے؟ سائنس ابھی تک اس سوال کا حتمی جواب نہیں دے سکی
ہم صرف اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ بھوؤں، پلکوں، کانوں اور ناک
بال ہمارے اندر گرد و غبار کو جانے سے روکتے ہیں۔ ڈاڑھی مرد
عورت کو ایک دوسرے سے ممتاز کرتی ہے۔ بعض ماہرین
خیال بھی ظاہر کیا ہے کہ انسانی جسم کے بال پسینہ اور پانی خا
کرنے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔

ایک بالغ انسان کے جسم پر تین سے پانچ لاکھ تک بال ہوتے
سُنہری بالوں والے لوگوں کے جسم پر زیادہ اور سرخ بالوں وا
لوگوں کے جسم پر کم بال ہوتے ہیں۔

دماغ معلومات کیسے محفوظ رکھتا ہے

محمد صابر چوہدری

دماغ کے معلومات کو محفوظ کرنے کے عمل کو یادداشت کہتے ہیں۔ سائنس دانوں نے یہ جاننے کی کوشش کی ہے کہ لوگ باتوں کو کیسے یاد رکھتے ہیں اور کیسے بھول جاتے ہیں؟ لیکن ابھی تک کوئی بھی اِس مسئلے کو مکمل طور پر حل نہیں کر سکا۔ ایک خیال کے مطابق جب کوئی شخص کوئی چیز اپنے دماغ میں محفوظ کرتا ہے تو اُس کے دماغ میں تبدیلیاں واقع ہو جاتی ہیں اور ایک نقشہ یا نمونہ دماغ میں باقی رہ جاتا ہے۔ اس نقشے کو یادداشت کہتے ہیں۔ یہ یادداشت وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کمزور ہوتی چلی جاتی ہے۔

کسی بات کو یاد رکھنے کا انحصار اُس بات کی نوعیت پر ہوتا ہے عام طور پر رنجیدہ کرنے والی باتیں جلدی بھول جاتی ہیں اور خوش کرنے والی باتیں زیادہ دیر تک یاد رہتی ہیں۔

مختلف چیزوں کو یاد کرنے کا انحصار دماغ کی اہلیت پر بھی ہے۔ جس دماغ کی نشوونما اچھی ہوئی ہو وہ زیادہ پیچیدہ چیزیں یاد رکھ سکتا ہے۔ جبکہ عام دماغ سیدھی سادی باتیں ہی یاد رکھ سکتا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ معلومات دماغ کے کِس حصے میں محفوظ ہوتی ہیں؟ جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے سائنس دان اس بارے میں مکمل طور پر نہیں جانتے۔ بعض کا خیال ہے کہ معلومات محفوظ کرنے کا کام کارٹیکس (Cortex) یعنی مغز کی بیرونی تہ انجام دیتی ہے۔ یہ بل دار اور جھری دار سطح ہوتی ہے اور دماغ کا زیادہ تر حصہ اسی پر مشتمل ہوتا ہے۔

اگر کارٹیکس کے کچھ مخصوص حصوں کو بجلی کے ہلکے کرنٹ سے تحریک دی جائے تو آدمی کو ماضی کی پُرانی باتیں یاد آجاتی ہیں۔ اسی طرح اگر کارٹیکس کو کوئی چوٹ لگ جائے تو آدمی اپنی ماضی کی یادداشت کھو دیتا ہے۔

کچھ ماہرین کا یہ بھی خیال ہے کہ یادداشت کے اِس عمل میں دماغ میں کچھ کیمیائی تبدیلیاں واقع ہو جاتی ہیں اور مخصوص قسم کی دماغی رگیں کیمیائی شکل میں معلومات کو محفوظ کر لیتی ہیں۔

اِن تمام خیالات کے باوجود یہ بات ابھی تک راز ہی ہے کہ دماغ میں باتیں کیسے محفوظ رہتی ہیں؟

آپ کا خط ملا

● ماہنامہ تعلیم و تربیت جولائی 1989ء کا شمارہ خلافِ معمول جلدی مل گیا۔ حیرت ہوئی۔ سرورق لاجواب تھا۔ پھر اداریہ پڑھا کہ شاید کوئی خوش خبری نظر آئے۔ کوشش رائگاں نہیں گئی۔ انگوٹھی کہاں گئی اور کیوں اور کیسے کے بارے میں خوش خبری نظر آہی گئی۔ ویت نام کی لوک کہانی "مکھی کی گواہی" پسند آئی۔ بقیہ کہانیوں میں "ایمان کی قوت" "آسیبی بلی" "جھوٹی لڑکی"، "ظفری سائیکلوں والا"، "گڑیا والا پاگل" اور "بکرا کون" پسند آئیں۔ رسالے کی بہتری کے لیے چند تجاویز پیش ہیں۔
(پرنس وسیم عباس سیال کوٹ کینٹ)

پرنس صاحب، آپ کی تجویزیں بہت اچھی ہیں۔ ان شاء اللہ ہم ان پر عمل کرنے کی کوشش کریں گے۔

● اس ماہ کا تعلیم و تربیت بے حد پسند آیا۔ ٹائیٹل تو ویسے بھی خوب ہوتا ہے۔ آپ سے میری گزارش ہے کہ تعلیم و تربیت میں معلوماتی مضامین کے بجائے کہانیاں زیادہ دیا کریں۔ اگر آپ تعلیم و تربیت کے 56 صفحات سے 60 کر دیں تو نہ صرف میں بہت خوش ہوں گا بلکہ میرا خیال ہے تعلیم و تربیت کے اور قاری بہن بھائی بھی بے حد خوش ہوں گے۔ (ظہیر، اچھرہ لاہور)

● جولائی کا تعلیم و تربیت ملا۔ سرورق سے لے کر آخر تک ہر چیز عمدہ تھی۔ "داؤدی علمی آزمائش" کو ختم کر دیا جائے اور "داؤدی علمی معمہ" بھی دوبارہ شروع نہ کیا جائے۔ بلکہ کوئی اور ہی مقابلہ شروع کیا جائے۔ جس کا جواب ہم اپنے ذہن سے سوچ کر دے سکیں۔ (محمد ادریس قریشی، منڈی بہاؤالدین)

● جولائی کا شمارہ بہت اچھا لگا۔ تمام کہانیاں اچھی تھیں۔ "کیوں اور کیسے" بہت اچھا سلسلہ ہے۔ انگوٹھی کہاں گئی بہت اچھا ناول ہے۔ لطیفے بھی بس اچھے ہی تھے۔ آپ علمی آزمائش جاری رکھیں اور پہیلے والا بور مقابلہ شروع نہ کریں۔ (محمد عامر، پرانا سکھر)

● اس ماہ کا تعلیم و تربیت کافی اچھا ہے۔ سرورق بہت خوب صورت تھا۔ کہانیاں ساری معیاری تھیں۔ لیکن انگوٹھی کہاں گئی؟ بکرا کون؟ ایمان کی قوت اور آسیبی بلی بہت پسند آئیں۔ داؤدی علمی آزمائش ایک اچھا سلسلہ ہے۔ اس کو جاری رکھا جائے۔ نیا معلوماتی سلسلہ "کیوں اور کیسے" بہت پسند آیا۔ کلک شیر شاہ سوری بھی بہت اچھا تھا۔ (ظفر آفتاب علی خان، شادباغ لاہور)

آپ نے "آپ بھی لکھیے" اور "ہونہار مصور" کے لیے جو موضوع تجویز کیے ہیں، وہ بہت اچھے ہیں۔

● چھٹیاں اچھی گزر رہی ہیں اور اسکول کا کام بھی ہو رہا ہے۔ ان چھٹیوں میں بڑی عید آرہی ہے جس کی پیشگی عید مبارک ہم نے آپ کی طرف سے قبول کی اور آپ بھی ہماری طرف سے عید مبارک قبول کیجیے۔ تعلیم و تربیت کا عام شمارہ دوسرے رسالوں کے خاص نمبروں سے بہتر ہوتا ہے لیکن آیندہ "انگوٹھی کہاں گئی" کی ایک ہی قسط دیجیے۔ اس طرح ہم زیادہ سے زیادہ کہانیاں پڑھ سکیں گے۔ (فیصل عبدالستار کھارادر کراچی)

● جولائی کے شمارے کا سرورق بے حد بھایا۔ کہانیوں میں ظفری سائیکلوں والا، جھوٹی لڑکی، اور مکھی کی گواہی سب سے اچھی لگیں۔ کیوں اور کیسے بے حد دلچسپ، مفید اور معلوماتی سلسلہ ہے۔ داؤدی علمی آزمائش کو جاری رکھا جائے۔ لیکن اس میں ہر طرح کے معلوماتی سوالات ہونے چاہئیں۔
(سید اصغر علی شاہ بخاری۔ لانڈھی کراچی)

● میں نے پہلی دفعہ تعلیم و تربیت پڑھا۔ بہت پسند آیا۔ جولائی کے تعلیم و تربیت کا سرورق نہایت شاندار تھا۔ کہانیوں میں ایمان کی قوت اور انگوٹھی کہاں گئی بہت شاندار تھیں۔ اس کے علاوہ بلاعنوان بہت اچھا سلسلہ ہے۔ (قاسم علی، سکیر ضلع خوشاب)

● مکھی کی گواہی، ایمان کی قوت، آسیبی بلی، انگوٹھی کہاں گئی اچھی تھیں۔ ہونہار مصور، کلک، اور وائلڈ لائف بھی نہایت اچھے سلسلے ہیں۔ (سید وسیم رضا، مرینہ ضلع گجرات)

● سرورق بہت ہی اچھا تھا۔ کہانیوں میں مکھی کی گواہی، آسیبی بلی، انگوٹھی کہاں گئی، جھوٹی لڑکی، بہت پسند آئی لطائف بھی بہت مزے دار تھے۔ سپورٹس میں پولو بھی اچھا تھا۔ (محمد شاہد، شہر کہوڑ)

● تقریباً 8 سال سے تعلیم و تربیت پڑھ رہا ہوں میں نے اسے سب سے بہتر پایا ہے۔ انگوٹھی کہاں گئی، ایمان کی قوت، اور مکھی کی گواہی اچھی کہانیاں تھیں۔ (رضوان حیدر میاں چنوں)

آپ بھی لکھیے

جب ہم آزاد ہوئے

محسن رضا، نیو سمن آباد لاہور

"ابو، کیا ہم پاکستان حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے؟" نو سالہ احمد نے آج سے 42 سال پہلے اپنے والد سے پوچھا تھا۔ "کیوں نہیں بیٹا۔ ہمارے قائدِ اعظم ایک بہت بڑے لیڈر ہیں۔ انہوں نے کہا ہے کہ ہم ان شاء اللہ پاکستان ضرور حاصل کریں گے"۔

"مگر ابو یہ موہن اور وِکرم وغیرہ کہتے ہیں کہ ہمارے لیڈر ہمیں بے وقوف بنا رہے ہیں ہندو کبھی پاکستان نہیں بننے دیں گے۔"

"بیٹا یہ لوگ غلط کہتے ہیں۔ ہم پاکستان ضرور حاصل کریں گے۔"

"اِن شاء اللہ" دونوں نے ایک زبان ہو کر کہا دونوں کی آنکھوں میں اُمید کی چمک تھی۔

احمد اپنے والدین اور بہنوں کے ساتھ ضلع گورداس پور کے ایک گاؤں نور پور میں رہتا تھا۔ وہ ایک ایسے اسکول میں پڑھتا تھا جہاں ہندو اور سکھ بھی پڑھتے تھے۔ یہ لوگ مسلمانوں اور ان کے وطن پاکستان کے سخت دشمن تھے۔ احمد اپنے دوسرے مسلمان طالب علم ساتھیوں کے ہمراہ روزانہ جلوس نکالتا اور اپنی ننھی ننھی مُٹھیاں بھینچ کر اور گلا پھاڑ کر نعرہ لگاتا "لے کے رہیں گے پاکستان۔ بن کے رہے گا پاکستان"۔ "قائد اعظم زندہ باد"۔ "مسلم لیگ زندہ باد"۔ اس کی کئی مرتبہ وکرم اور موہن وغیرہ سے ان جلوسوں کی وجہ سے لڑائی ہو چکی تھی۔

آخر کار وہ دن بھی آ گیا جس کا سب کو انتظار تھا۔ یعنی چودہ اگست کا دن۔ اس دن جیسے ہی پاکستان بننے کا اعلان ہوا تمام مسلمانوں کے پاؤں مارے خوشی کے زمین پر نہ ٹکتے تھے۔ احمد کے ابا پاکستان جانے کا دن اور تاریخ مقرر کرنے کے لیے چودھری مراد بخش کے گھر چلے گئے۔ انہیں گئے تھوڑی دیر ہوئی تھی کہ ہندو اور سکھوں نے احمد کے گھر پر حملہ کر دیا اور اس کی ماں اور بہنوں کو چُھرے اور کرپانیں مار مار کر شہید کر دیا۔ احمد یہ سارا منظر پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا کہ ایک سکھ نے "یہ لے اپنا پاکستان" کہہ کر اس کے پیٹ میں بھی کرپان گھونپ دی۔ وہ اسے مردہ سمجھ کر چلے گئے۔

احمد کے ابا جب واپس آئے تو یہ ہول ناک منظر دیکھ کر اپنے حواس کھو بیٹھے۔ چودھری مراد بخش نے انہیں یہ کہہ کر تسلی دی کہ یہ سب شہید ہیں اور اپنے وطن پر بہادروں کی طرح قربان ہوئے ہیں۔ احمد میں تھوڑی بہت جان باقی تھی۔ اس کے ابو نے اسے گود میں اٹھایا اور بمشکل پاکستان جانے والی ریل گاڑی میں سوار ہوئے۔ تمام راستے احمد صرف دو مرتبہ ہوش میں آیا۔ دونوں مرتبہ اس نے پوچھا تھا "کیا پاکستان آ گیا"؟ اور اس کے ابو نے جواب دیا تھا "بس بیٹا، ہم تھوڑی دیر میں پاکستان پہنچنے والے ہیں"۔

آخر کار وُہ لُٹے پٹے پاکستان پہنچے۔ پاکستان کی فضا میں کچھ ایسا جادو تھا کہ احمد اسٹیشن پر ہی ہوش میں آ گیا۔ اس نے پوچھا کیا ہم پاکستان پہنچ گئے ہیں؟ "اس کے باپ نے جواب دیا "ہاں بیٹے"۔ احمد نے ایک نظر پاکستان کی سرزمین کو دیکھا اور پھر ہمیشہ کے لیے آنکھیں موند لیں۔ مسافروں میں موجود ایک ڈاکٹر اپنے دوست سے کہہ رہا تھا "پتہ نہیں اس میں کون سی لگن تھی کہ یہ اتنی دیر زندہ رہا"۔

شاید ڈاکٹر یہ نہیں جانتا تھا کہ یہ لگن اپنے پاک وطن کو دیکھنے کی تھی جس نے احمد کو اتنی دیر زندہ رکھا۔

(پہلا انعام: 50 روپے کی کتابیں)

2

سعدیہ غوری، کراچی

چودہ اگست کی رات کو میں نے خواب میں دیکھا کہ ہم آزاد ہو گئے ہیں۔ ہمارے پیارے وطن پاکستان میں اسلام کا بول بالا ہے۔ اس کے باشندوں میں اتحاد اور اتفاق کی فضا قائم ہے۔ سب آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ نہ کوئی کالا ہے نہ گورا۔ نہ مہاجر ہے نہ سندھی۔ سب پاکستانی ہیں، اور پاکستان کی سربلندی کے لیے ایک جان ہو کر تن من دھن سے کوشش کر رہے ہیں۔ ہر طرف خوشی ہی خوشی ہے اور ہر جگہ امن ہی امن ہے۔ سب لوگوں کی عزت اور جان و مال محفوظ ہے۔ غرض جس آزادی اور جس وطن کی ہمیں تمنا تھی، وہ ہمیں مل گیا ہے۔

لیکن پھر کلاشنی کوف کی آواز سے میری آنکھ کھل جاتی ہے۔ آج پھر ایک مسلمان بھائی نے کسی مسلمان بھائی کو جان سے مار دیا

بلاعنوان

اس کارٹون کا عنوان لکھیے اور 1000 روپے کے انعامات حاصل کیجیے۔ آخری تاریخ 10 اگست ہے۔

[جو]لائی 1989ء کے کارٹون کے بے شمار عنوان موصول ہوئے ، جن میں سے ججوں کو صرف دو عنوان "آ بیل مجھے مار" اور "اینٹ کا [جوا]ب پتھر" پسند آئے ۔ جن بچوں نے یہ عنوان تحریر کئے ہیں ان کے نام یہ ہیں : شمائلہ اقبال ، اچھرہ لاہور ۔ عماد لئیق ، اقبال ٹاؤن ۔ محمد عبدالسلام ، کراچی 41 ۔ محمد حسن ، قادرپوراں ۔ زمانہ ناز ، لاہور کینٹ ۔ وقاص بن انعام ، فیصل آباد ۔ مہدی حسن ، ۔ صادق علی ، فیصل آباد ۔ محمد عمران مغل ، جنڈانوالہ ۔ کامران احمد خان ، کراچی نمبر 19 ۔ اعجاز الرحمان ، قصور ۔ عامر خان ، راولپنڈی ۔ روبینہ جوہر ، پشاور ۔ عطاء المحسن طاہر ، پنڈ دادن خان ۔ عطیہ رحمان ، اسلام آباد ۔ صائمہ ذکریا ، لاہور ۔ فیصل [فی]صل آباد ۔ محمد منظر رضا ، سیت پور ۔ رضوان الحسن کیانی ، اسلام آباد ۔ طاہرہ بتول ، سیت پور ۔ منیر رضا ، سیت پور ۔ فیصل آباد ۔ بادیہ شفیق ، فیصل آباد ۔ حمزہ زبیر ، لاہور ۔ شازیہ الطاف ، فیصل آباد ۔ عمر جواد ، لاہور ۔

ان بچوں کو 40،40 روپے کی کتابیں دی گئی ہیں ۔

اپنی دکھ بھری کہانی سنائی تھی —وہ کہانی کچھ یوں ہے:

"پاکستان بننے سے پہلے ہم مشرقی پنجاب کے ایک قصبے میں رہتے تھے ۔ تحریک پاکستان زوروں پر تھی ۔ میں نے بھی اس تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ۔ سب لوگ بازاروں اور گلیوں میں نعرے لگاتے پھرتے تھے ۔ ہمارے لبوں پر بس ایک ہی نعرہ تھا "بٹ کے رہے گا ہندوستان ۔ بن کے رہے گا پاکستان۔" اور آخر کار مسلمانوں اور قائداعظم کی محنت رنگ لائی ، پاکستان بننے کا اعلان ہوا اور ہم پاکستان آنے کی تیاریاں کرنے لگے ۔

14 اگست 1947 کی صبح کو ہم سب گھر والے دوسرے بے شمار لوگوں کے ساتھ اسٹیشن پر کھڑے گاڑی کا انتظار کر رہے تھے ۔ پاکستان بننے کی خوشی اور پاکستان آنے کی خوشی سے میں پھولا نہیں سمارہا تھا کہ اتنے میں گاڑی آتی ہوئی دکھائی دی اور ہم گاڑی میں ایک دوسرے کو دھکے دیتے ہوئے چڑھنے لگے ۔ سب کے سر پر بس ایک ہی دھن سوار تھی کہ جلد سے جلد پاکستان پہنچ جائیں۔ اتنے میں انجن نے سیٹی بجائی اور گاڑی اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئی ۔ ہم سب خوش گپیوں میں مصروف تھے ۔ میرے ساتھ میرے ماں باپ ، ایک بھائی اور ایک بہن تھی ۔ گاڑی جب دوسرے اسٹیشن پر رکی تو پتا نہیں کہاں سے بہت سے ہندو اور سکھ آنکلے اور لوٹ مار اور قتل و غارت شروع کر دی ۔ کسی کو کسی کا ہوش نہ تھا ۔ سب اپنی جان بچانے میں لگے ہوئے تھے ۔ میرے گھر والوں میں صرف میں ہی بچا تھا ۔ میرے ماں باپ اور بہن بھائی کو ان درندوں نے قتل کر دیا تھا۔ میرے علاوہ چار پانچ آدمی اور بچے تھے اور انہی کے ساتھ میں پاکستان آیا تھا ۔ کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ اگر میں بھی مر جاتا تو اچھا ہوتا۔ لیکن پھر سوچتا ہوں کہ اپنے پیارے ملک کی مٹی میں تو دفن ہونگا ۔ بس یہی خُوشی مجھے ہر وقت خوش رکھتی ہے"۔ (چھٹا انعام: 25 روپے کی کتابیں)

ان ہونہار ادیبوں کی کوشش بھی قابلِ تعریف ہے۔ انہیں 15,15 روپے کی کتابیں دی گئی ہیں۔

غلام محمود، ضلع اٹک۔ شازیہ غلام سرور، لاہور۔ محمد شہزاد رضا، ملیر کالونی کراچی 37۔ تہمینہ کوثر، نارتھ ناظم آباد کراچی۔ امانت علی، ضلع گجرات۔ آفتاب احمد خٹک، پشاور کینٹ۔ سیّد عمران شاہ، ایبٹ آباد۔ افشاں مگسی بلوچ، نواب شاہ۔ نعیم افضل، اسلام آباد۔ مصدق عنایت، لالہ موسیٰ۔ اظہر مقبول، گوجرانوالہ۔ ندیم ولو، ہارون آباد۔ محمد غزالی، کراچی۔ ثوبیہ رشید، ملتان۔ ملک محمد نعیم قیصر، سیالکوٹ۔ علی احمد پستا، لاہور۔ رانا ابرار احمد، لالہ موسیٰ۔ سارا الیاس ڈار، اسلام آباد۔ منورام، پنو عاقل۔ شاکر حسنین، ماڈل ٹاؤن لاہور۔ خرم سعید، جھنگ صدر۔ محمد عامر، پرانا سکھر۔ احتشام احمد خاں، گوجرانوالہ۔ فیصل مسعود، نواب شاہ۔ محمد عاقل احمد خاں، پرانا سکھر۔ آمنہ حسن، اسلام آباد۔ محسن مقبول، بہاول پور۔ عطیہ رحمان، اسلام آباد۔ حمیرا ظفر، اسلام آباد۔ ایاز بادشاہ، اکوڑا خٹک۔ میاں مظہر اقبال، ملتان۔ ثروت ممتاز، کراچی۔ وقار احمد انصاری، بہاول پور۔ سمیع سراج، ڈیرہ اسماعیل خاں۔ شکیل احمد، نیو کراچی۔ محمد زبیر خالد، راولپنڈی۔ شہزاد شوکت علی، گل بہار کراچی۔ فرخ شریف، بہاول پور ۔ فاطمہ، لاہور۔ عدیل اکبر رانا، راولپنڈی۔ عظمیٰ حسین، لاہور۔ محمد اعظم خان، لاہور۔ محمد عرفان احمد، گوجرانوالہ۔ عمران نعیم خان، کراچی۔ ثمینہ نیاز، ڈیرہ اسماعیل خان۔ نعمان ہاشمی، لودھراں۔ محمد احمد بابر، کراچی۔ خلیق الرحمان لاہور کینٹ۔ ظلِ رحمان، اوکاڑہ۔ فیاض ملک، ہارون آباد۔

آپ کی تحریر کیوں شائع نہیں ہوتی؟

اس لیے کہ آپ ضروری باتوں کا خیال نہیں رکھتے اگر اپنی تحریر شائع کروانا چاہتے ہیں تو
■ پہلے صفحے پر عنوان کے ساتھ پورا نام اور پتا درج کریں۔ ■ صاف ستھرا اور خوش خط لکھیں۔ ■ ایک صفحہ چھوڑ کے لکھیں۔ ■ پنسل سے نہ لکھیں۔ ■ اپنی تمام تحریریں الگ الگ کاغذ پر لکھیں۔ ■ کوپن تصویر یا معمے کے ساتھ پن اپ کریں۔ بلا عنوان، آپ بھی پوچھیے، آئیے دوست بنائیں، آئیے مسکرائیں، ساتھی ایک ہی لفافے میں بھیج سکتے ہیں آپ بھی لکھیے (ننھے ادیب) اور آپ کا خط ملا، ایک لفافے میں اور ذوقی علمی معما الگ لفافے میں سب لفافوں پر اُن کے شعبوں کا نام لکھ کر ارسال کریں اپنی تحریریں ساتھی اس پتے پر ارسال کر سکتے ہیں: ایڈیٹر ماہنامہ تعلیم و تربیت 32۔ بن بادیس (ایمپریس) روڈ لاہور۔
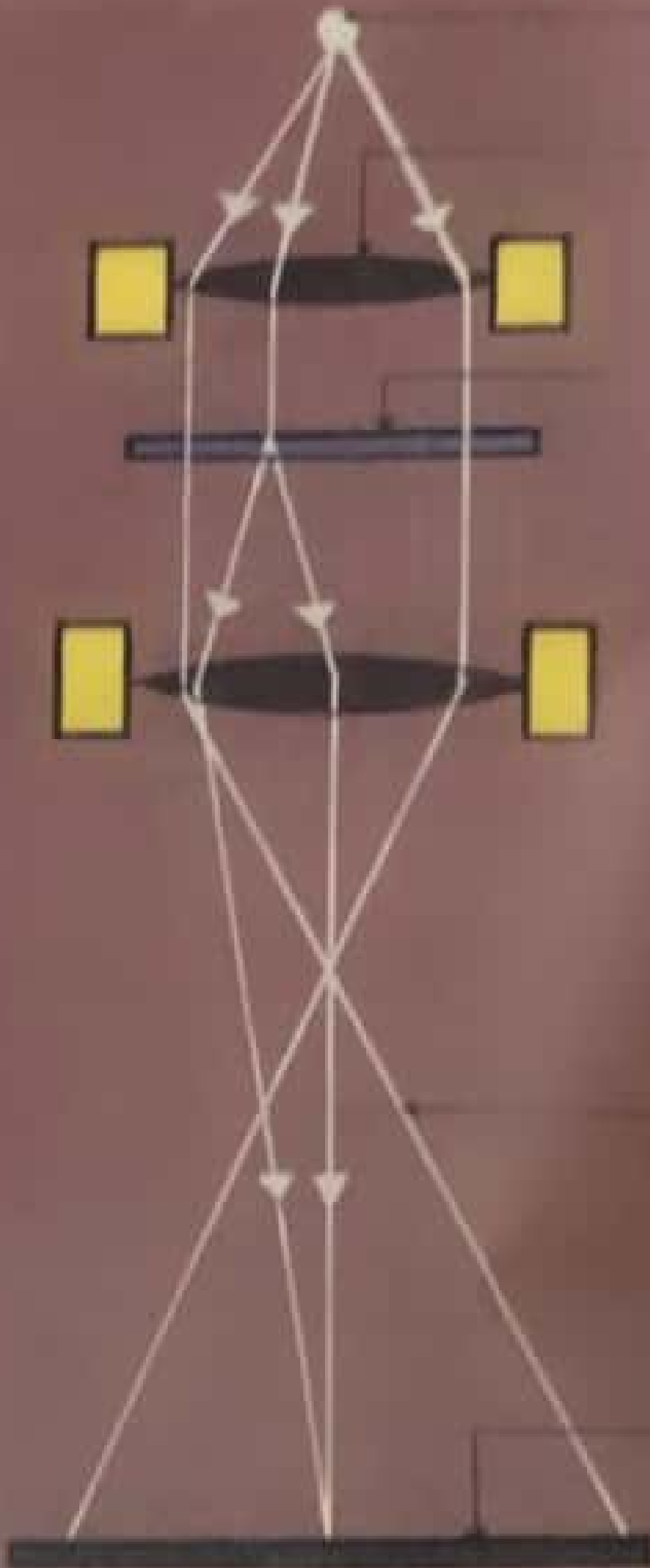
ایک دن دوستوں کی محفل میں بیٹھے شیر خان کے منہ سے سہوا یہ بات نکل گئی کہ اگر سارے پٹھان میرے جھنڈے تلے جمع ہو جائیں تو میں مغلوں کو ہندوستان کی سرزمین سے باہر نکال سکتا ہوں۔
کسی طرح یہ بات بابر کے کانوں تک بھی جا پہنچی وہ اس بارے میں مناسب قدم اٹھانے کے لیے سوچنے لگا۔
مزید دیر کرنا مناسب نہیں شیر خان کو فوراً گرفتار کر لیا جائے۔
مغل دربار میں شیر خان کے خیر خواہ بھی تھے انہوں نے یہ بات فوراً شیر خان تک پہنچا دی۔
دشمنوں کے نرغے میں آنے سے پہلے ہی شیر خان نے وہاں سے فوری فرار ہی مناسب سمجھا۔ چنانچہ بھاگ کر وہ اپنے پرانے خیر خواہ بادشاہ سلطان محمد کے دربار میں جا پہنچا، جو ابھی تک مغل یلغار سے محفوظ تھا۔
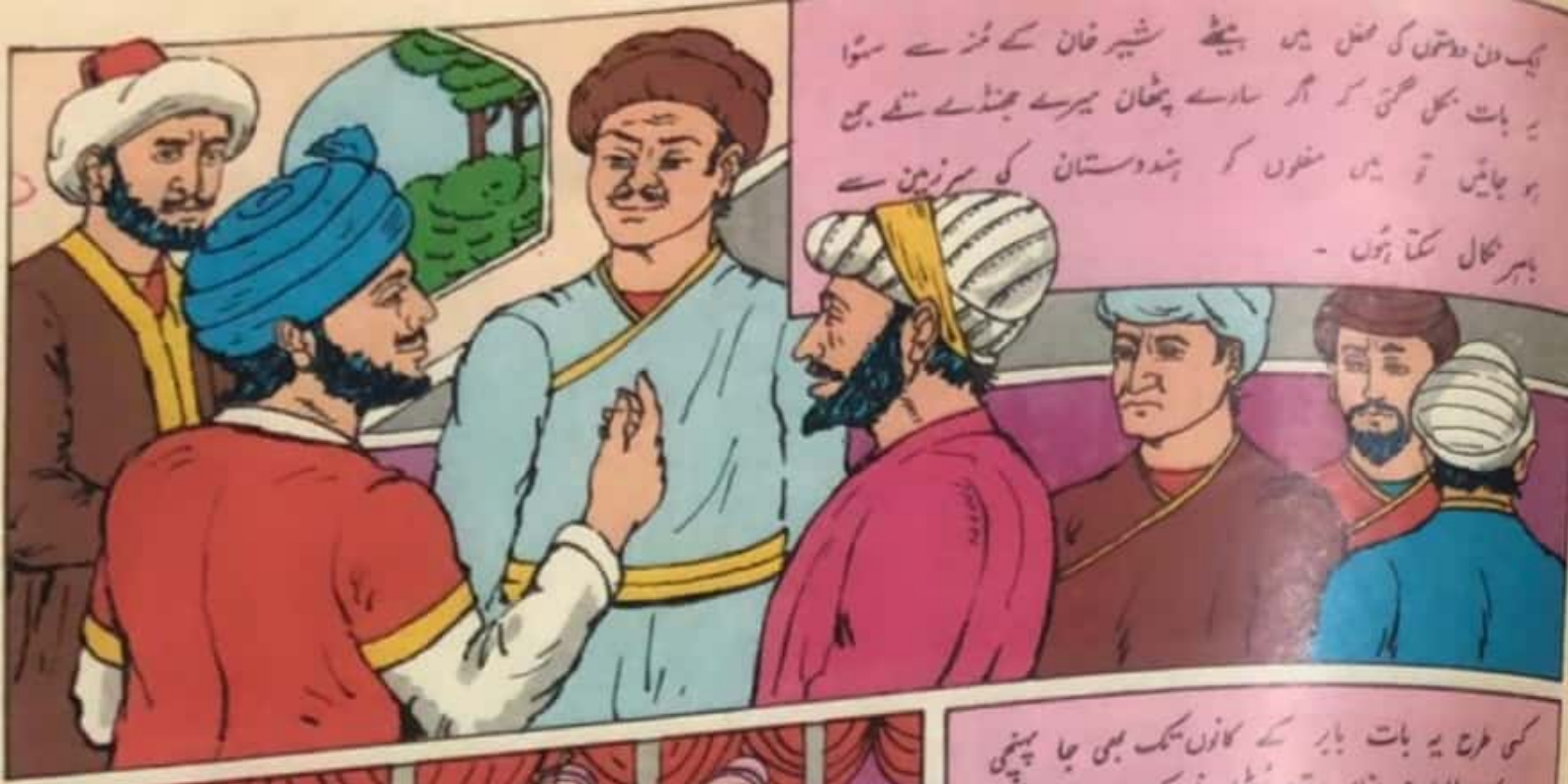
ہمایوں ! شیر خان سے ہمیشہ چوکنا رہنا۔ یہ شخص کسی وقت بھی مغل سلطنت کے لیے خطرہ ثابت ہو سکتا ہے۔ مجھے تو اس کی پیشانی پر واضح طور پر بادشاہت کے آثار نظر آ رہے ہیں۔
جی ابا حضور ! مجھے بھی اس شخص کے اطوار کچھ اچھے دکھائی نہیں پڑتے۔ آپ بے فکر رہیں میں اس پر ہمیشہ کڑی نظر رکھوں گا۔
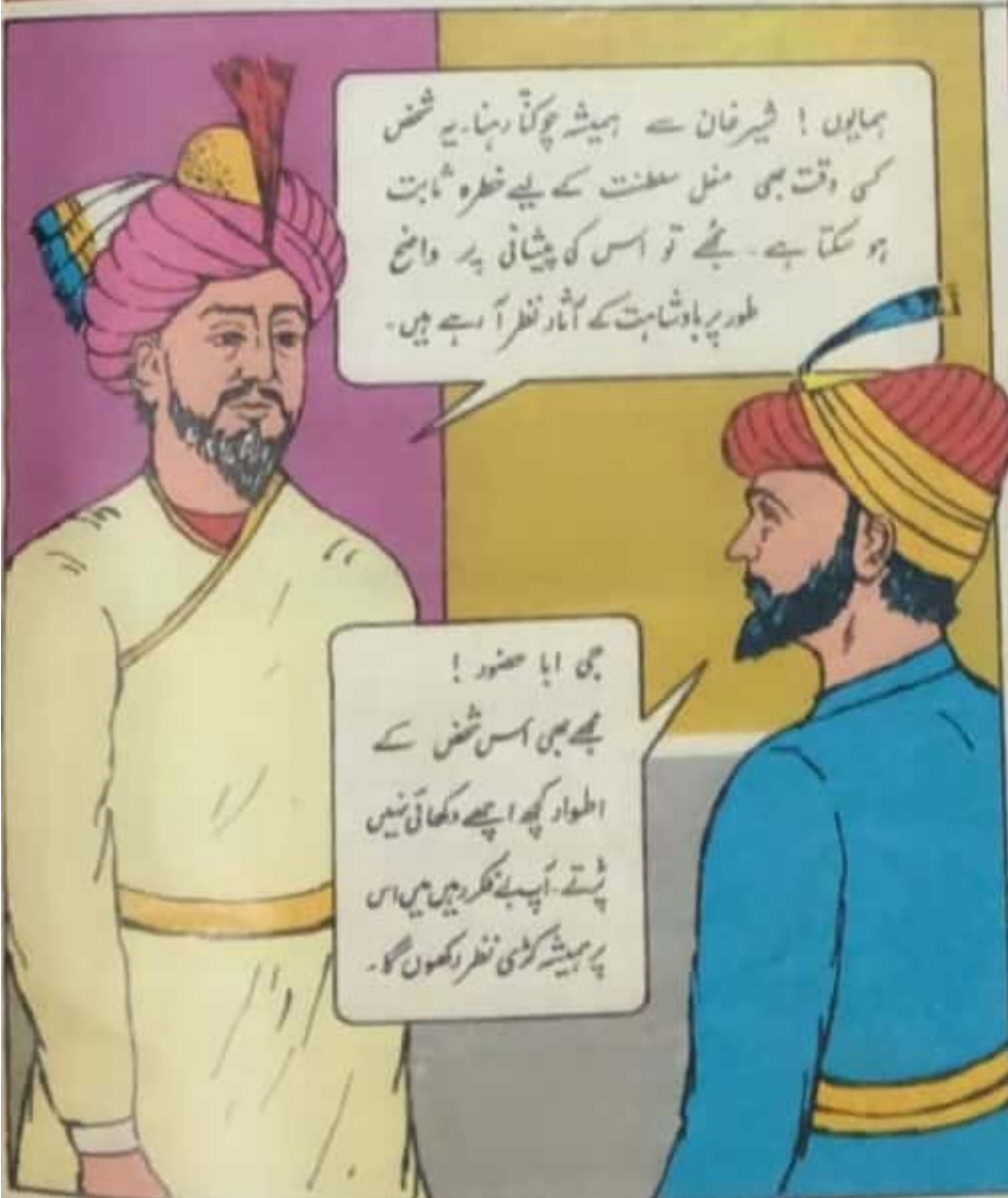
شیرخان واپس بہار بادشاہ سلطان محمد کے دربار میں ۔
عالیجاہ ! اب میرا شہنشاہ بابر کے دربار میں مزید رہنا مناسب نہیں اس لیے آپ مجھے پھر اپنی خدمت کا موقع دیں ۔
شیرخان ! میں تو ہمیشہ سے تمہاری بہادری اور دانشمندی کا قائل ہوں میرے دربار میں آپ جیسے تجربہ کار انسان کی سخت ضرورت ہے ۔ اب میں آپ کو اپنے کم سن شہزادے جلال خان کا اتالیق مقرر کرتا ہوں ۔
شیرخان نے شہزادہ جلال خان کی تعلیم و تربیت میں بھرپور دلچسپی لی اور پھر ایک روز ۔ ۔ ۔ ۔
عزیز شہزادے ! کامیاب حکمران کے لیے ضروری ہے کہ وہ تلوار پر مکمل گرفت کے ساتھ ساتھ عوام کے دکھ درد کو بھی سمجھتا ہو اور اُن کی بھلائی کا دلی طور پر خواہاں ہو ۔
جی ہاں ! یہ حقیقت ہے کہ جب سے آپ نے میری تعلیم و تربیت کا بیڑہ اُٹھایا ہے میری آنکھیں کھل گئی ہیں ۔
یہی غریب مزارعے اور کسان جو آپ دیکھ کر آئے ہیں کسی ملک کی خوشحالی کا اصل باعث ہوتے ہیں ۔ ان کو بھی خوشحال ہونا چاہیے ۔
استادِ محترم ! آپ بالکل بجا فرماتے ہیں ہمارے لیے اپنے عوام کی فلاح و بہبود کا خیال رکھنا از بس ضروری ہے ۔

SWISS BUTTER SCOTCH
Swiss Candies
WOW! IT'S BUTTER SCOTCH
WANT IT TOO!!
Swiss Surpris
Swiss Candies
Fruit Candies
Swiss Candies

وائلڈ لائف
یورپی سُرخاب
موسمِ بہار اور موسمِ گرما میں یورپ اور شمالی ایشیا میں نسل کشی کرتا ہے۔ موسمِ سرما جنوبی یورپ، جنوبی ایشیا اور شمالی افریقہ میں گزارتا ہے۔
عام طور پر سمندر، دریاؤں اور جھیلوں کے ریتلے کناروں یا پھر اُن کھیتوں میں جہاں دھان کی فصل کٹ چکی ہو، مِلتا ہے۔ اپنی خوراک، بطخ کی طرح، کیچڑ میں سے حاصل کرتا ہے۔ عام طور پر خاموش رہتا ہے۔ کبھی کبھی آہنگ آہنگ کی بلند آواز نکالتا ہے۔ دوپہر کے وقت سمندر یا جھیل کے کھلے پانی میں تیرتا ہے۔
اپنا گھونسلا زمین پر بناتا ہے۔ مادہ 8 سے 15 تک انڈے دیتی ہے، جنھیں 28 دِن تک سیتی ہے۔ بچّے 25 دِن کے بعد اُڑنے کے قابِل ہو جاتے ہیں۔ نر اور مادہ دونوں بچّوں کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔
جنگلی حیات قومی ورثہ ہے
اس کی حفاظت کرنا ہمارا فرض ہے۔

شیر خان ! اب تمہاری ذمہ داریاں اور بھی بڑھ گئی ہیں۔ سلطنت کے نظم و نسق کے ساتھ ساتھ سرحدوں پر بھی نگاہ رکھنا ہوگی۔
ملکہ عالیہ ! مجھے اپنی ذمہ داریوں کا پورا پورا احساس ہے آپ مطمئن رہیں۔
ملکہ دُودو بھی کچھ عرصہ بعد فوت ہو گئیں اور اس طرح سلطنت کی تمام تر ذمہ داری
شیر خان پر آن پڑی اور پھر یوں ہُوا کہ ایک دن ایک درباری نے اچانک اطلاع دی....

سائنس

خُردبین

امجد علی

بعض اشیاء اتنی چھوٹی ہوتی ہیں کہ آنکھ سے صاف طور پر دکھائی نہیں دیتیں۔ ایسی چیزوں کی تصویر یا عکس کو بڑا دکھانے کے لئے خُردبین استعمال کی جاتی ہے۔ ہر خُردبین کسی چھوٹی چیز کو ایک خاص حد تک بڑا کر کے دکھا سکتی ہے۔ اس حد کو خُردبین کی استطاعت (Magnification) کہا جاتا ہے۔ اگر ایک خُردبین کی استطاعت "x100" ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ خُردبین چیز کو اصل جسامت سے 100 گنا بڑا دکھا سکتی ہے۔

بصری خُردبین (Optical microscope) میں چھوٹی اشیاء کا بڑا عکس حاصل کرنے کے لئے شیشے کے عدسے (Lenses) استعمال کیے جاتے ہیں۔ اِس کی سادہ ترین شکل گول فریم میں لگا ہوا ایک مُحدّب عدسہ (convex lens) ہے۔ اس کو بڑا دکھانے والا شیشہ (Magnifying glass) کہتے ہیں۔ جس چیز کو بڑا کر کے دیکھنا مقصود ہو اس کے اوپر رکھ کر اسے آنکھوں کی طرف آہستہ آہستہ لایا جاتا ہے حتّٰی کہ چیز کا واضح اور بڑا عکس حاصل ہو جائے۔ چنانچہ اِس سادہ خُردبین سے ہم ڈاک کے ٹکٹوں، چھوٹی آبی مخلوقات اور کتابوں کی باریک لکھائی کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔

سائنسی تجربہ گاہوں میں استعمال ہونے والی خُردبین زیادہ پیچیدہ ہوتی ہے۔ اس میں کئی عدسے ہو سکتے ہیں۔ لیکن اصل چیز کو بڑا دکھانے کا کام صرف دو عدسے سرانجام دیتے ہیں۔ ایک آنکھ کے قریب ہوتا ہے۔ اِسے "آئی پیس" کہتے ہیں۔ دُوسرا عدسہ نیچے مشاہدہ کے لئے رکھی ہوئی چیز کے قریب ہوتا ہے۔ اس کو اوبجیکٹو (Objective) کہا جاتا ہے۔ پہلے عکس اوبجیکٹو اور آئی پیس کے درمیان بنتا ہے۔ آئی پیس اسے کئی گنا بڑا کر کے دکھاتا ہے۔

محمد رضوان، سرائے صالح (پانچواں انعام 20 روپے کی کتابیں)

صدف فیاض، بنوں کینٹ (چھٹا انعام 15 روپے کی کتابیں)

ہمارا مقدر بن چکی ہے تو وہ الگ ہو گئے اور انگریزوں نے مسلمانوں کا قتلِ عام شروع کر دیا۔ انگریز تاتاریوں کو درندے کہتے ہیں۔ تاتاری قوم تو تہذیب کے لفظ سے ناآشنا تھی، مگر انگریز تہذیب یافتہ اور تعلیم یافتہ قوم تھی انہوں نے مسلمانوں کے ساتھ ایسا سلوک کیا کہ اس کے سامنے تاتاریوں کے ظلم و ستم بھی ہیچ ہیں۔ مختصر یہ کہ آزادی کے پروانوں پر جو کچھ گزری اسے لکھتے ہوئے قلم کا سینہ پھٹتا ہے۔

ہندوستان میں مسلمانوں کا مستقبل اتنا تاریک ہو چکا تھا کہ روشنی کی کوئی کرن نظر نہیں آتی تھی۔ ان کی ذلّت و رسوائی کا سلسلہ کبھی ختم ہوتا نظر نہیں آتا تھا۔ ایسے اڑے وقت میں سر سیّد احمد خان، مولانا حسرت موہانی، مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، ظفر علی خان اور قائد اعظم محمد علی جناح جیسے رہنما میدان عمل میں اترے۔ انہوں نے مسلمانوں میں زندہ رہنے کا شعور پیدا کیا، آزادی کی تڑپ پیدا کی اور انہیں ناامیدی اور مایوسی کے گھٹا ٹوپ اندھیرے سے باہر نکالا۔

آخر 23 مارچ 1940 کو مسلمانوں نے قائد اعظم محمد علی جناح کی زیرِ قیادت لاہور کے جلسۂ عام میں قراردادِ پاکستان منظور کی۔ قرارداد پاکستان تحریک پاکستان کی روح کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس پر ہندوؤں اور انگریزوں نے بڑا واویلا مچایا، لیکن مسلمانوں نے ان سب کا ثابت قدمی کے ساتھ مقابلہ کیا اور آخر 14 اگست 1947 کو قائد اعظم جیسے نڈر اور بے باک لیڈر کی قیادت میں پاکستان حاصل کر لیا۔

لیکن قیام پاکستان کے بعد ہم وہ مقصد بُھلا بیٹھے جس کے لیے پاکستان حاصل کیا تھا۔ یہ ہماری غفلتوں اور کوتاہیوں کا ہی نتیجہ ہے کہ ہم نے اپنے وطن عزیز کا ایک ٹکڑا کھو دیا ہے۔ وقت کا تقاضا ہے کہ ہم خود کو سنبھالیں اور آپس کے اختلافات بُھلا کر ملک کی حفاظت کریں۔

(چوتھا انعام: 35 روپے کی کتابیں)

5

ذیشان ناظم، واہ کینٹ

آزادی ایک نعمت ہے، ایسی نعمت جس کے آگے دُنیا کی بڑی سے بڑی نعمت ہیچ ہے۔ دولت، عزّت اور شہرت سب اس نعمت پر قربان ہیں۔ آزادی زندگی ہے اور غلامی موت۔ آزادی عزّت ہے اور غلامی ذلّت۔ وہ کون ہے جس کے دل میں آزادی کی تڑپ نہیں۔ انسان تو انسان جانور بھی آزادی پسند ہے۔

مسلمانوں نے برصغیر پاک و ہند پر تقریباً ایک ہزار سال تک حکومت کی۔ اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد مغل شہزادوں کی نااہلی کی وجہ سے سلطنت کمزور ہوتی گئی۔ ملک چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم ہو گیا۔ اس صورت حال سے انگریزوں نے فائدہ اٹھایا اور آہستہ آہستہ تمام ملک پر قبضہ کر لیا۔ انہوں نے مسلمانوں کو طرح طرح سے ستانا شروع کیا۔ صنعت و حرفت اور تعلیم و تجارت کے تمام دروازے مسلمانوں پر بند کر دیے گئے۔ گویا مسلمان اپنے ہی ملک میں غلامی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو گئے۔

مگر مسلمان اس غلامی کی زندگی کو کیوں کر قبول کر سکتے تھے۔ وہ جلد ہی جمال الدین افغانی، مولانا محمد علی جوہر اور علامہ اقبالؒ کے سجھائے ہوئے راستے پر چل پڑے۔ قائد اعظم محمد علی جناح کی آواز نے صُورِ اسرافیل کا کام کیا۔ ہندوستان کا ہر مسلمان قائد کی آواز پر لبیک کہتا ہوا مسلم لیگ کے جھنڈے تلے جمع ہو گیا اور آزادی کے حصول کے لئے دیوانہ وار آگے بڑھنے لگا۔ مخالفت کا طوفان اٹھا۔ آزمائشوں کی بھٹی گرم ہوئی۔ مگر مسلمان آگے ہی بڑھتے رہے۔ بالآخر قائد اعظم کی رہنمائی میں 14 اگست 1947 کو پاکستان وجود میں آگیا۔ جہاں ہم اسلامی روایات کے مطابق اپنی زندگی گزارنے کے قابل ہو گئے۔

ہم سب کو چاہئے کہ ہم پاکستان کی ترقی اور خوش حالی کے لیے دن رات محنت اور کوشش سے کام کریں۔ پاکستان ہمارا وطن ہے۔ ہمارا گھر ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم اس گھر کی حفاظت کے لیے ہر قسم کی قربانی کے لئے تیار رہیں۔ اخوت اور بھائی چارے کی فضا پیدا کریں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ملک کے کُھلے اور چُھپے دشمنوں سے ہر لمحہ ہوشیار رہیں اور ان کے آلۂ کار نہ بننے پائیں۔ ہمیں چاہئیے کہ ہم اتحاد و اتفاق سے ایسی قوّت حاصل کر لیں کہ کسی دشمن کو ہماری طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی بھی جرأت نہ ہو۔ پاکستان زندہ باد!

(پانچواں انعام: 30 روپے کی کتابیں)

6

محمد طاہر، ڈیرہ اسماعیل خان

جب بھی 14 اگست آتا ہے تو میں اپنے ماضی میں کھو جاتا ہوں۔ وہ دن مجھے شدت سے یاد آتا ہے جب دادا جان نے ہمیں

ہے۔ گھر میں ہر کوئی سہما ہوا ہے۔ امی کہہ رہی ہیں کہ باہر کوئی نہ جائے۔ دروازہ اندر سے بند کر دیا گیا ہے کہ کہیں قاتل گھر میں گھس کر سب کو ختم نہ کر دیں اور میں سوچ رہی ہوں کہ امی تو کہتی ہیں کہ ہم نے بڑی جدوجہد اور عظیم قربانیوں کے بعد آزادی حاصل کی تھی۔ کیا ہم اس لیے آزاد ہوئے ہیں کہ محض زبان اور نسل کی وجہ سے ایک دوسرے کے دشمن بن جائیں؟ میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ جو کچھ میں نے خواب میں دیکھا وہ حقیقت تھا یا جو میں کھلی آنکھوں سے دیکھ رہی ہوں، وہ حقیقت ہے؟

کاش! کوئی ہمیں بتائے کہ ہم نے کس لیے آزادی حاصل کی تھی۔ جان سے زیادہ عزیز وطن پاکستان کس لیے بنایا تھا؟ کافر کے ہاتھ سے مرتے ہیں تو شہادت نصیب ہوتی ہے۔ مسلمان کے ہاتھ سے مریں تو کون سی موت نصیب ہوگی؟ اگر ان سوالوں کے جواب مجھے مل جائیں تو میری روح کو چین حاصل ہو جائے۔

(دوسرا انعام: 45 روپے کی کتابیں)

3

آصف خان، چکنی پشاور

یہ ہمارے والد صاحب کی آپ بیتی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ پاکستان کی آزادی کے لیے مسلمانوں نے بہت بڑی بڑی قربانیاں دیں۔ آزادی سے پہلے ہمارا پیارا ملک پاکستان بھارت کا ایک حصہ تھا۔ مسلمانوں نے اپنے عظیم رہنما قائد اعظم محمد علی جناح کی رہنمائی میں پاکستان حاصل کیا۔

ہمارے والد صاحب کہتے ہیں کہ جب پاکستان آزاد ہوا تو اس وقت میری عمر 8 سال کی تھی اور میں دوسری جماعت کا طالب علم تھا۔ ہم بھارت کے شہر امرتسر میں رہتے تھے۔ پاکستان آزاد ہونے کے بعد ہندوؤں اور سکھوں نے مسلمانوں کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ اس لیے وہ پاکستان کی طرف ہجرت کرنے لگے۔ ہم نے بھی رات کو فیصلہ کیا کہ کل ہم اپنے پیارے ملک پاکستان چلے جائینگے جب ہم سب سو گئے تو تقریباً آدھی رات کے وقت شور و غل کی وجہ سے میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے دیکھا کہ میرے والدین خون میں لت پت پڑے ہیں اور میری بڑی بہن ان ظالموں سے لڑ رہی ہے۔ میں جلدی سے کہیں چھپ گیا اور پھر ان ظالموں نے میری بہن کو بھی مار دیا۔

صبح کو میں چھپتا چھپاتا امرتسر کے ریلوے اسٹیشن پر پہنچا اور رو کر لوگوں سے کہا کہ مجھے بھی اپنے ساتھ پاکستان لے چلو۔ چنانچہ ایک آدمی مجھے اپنے ساتھ پاکستان لے آیا۔ جب میں نے پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھا تو میں فخر محسوس کر رہا تھا کہ میں اب ایک آزاد ملک میں رہوں گا۔ لیکن جب 14 اگست کا دن آتا ہے تو مجھے وہ واقعہ بہت شدت سے یاد آتا ہے اور بے ساختہ میری آنکھوں سے آنسو نکل آتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ مجھے خوشی بھی ہوتی ہے کہ میں ایک آزاد ملک کا شہری ہوں۔ اس لیے میں کہتا ہوں کہ 14 اگست ہمارے خاندان کے لئے خوشیوں اور غم دونوں کا پیغام لے کر آتا ہے۔

(تیسرا انعام: 40 روپے کی کتابیں)

4

محمد لطیف، فرید ٹاؤن ضلع گوجرانوالہ

14 اگست کا دن ہماری آزادی کا دن ہے۔ اس دن برصغیر کے کروڑوں مسلمانوں کی آزادی کا چمن لہلہایا۔ ان کی برسوں کی محنت رنگ لائی اور دیرینہ خواہشوں اور تمناؤں کا سورج پاکستان کے روپ میں دنیا کے افق پر طلوع ہوا تھا۔ ہمارے بزرگوں نے اس ملک کے قیام کی تاریخ اپنے لہو سے رقم کی ہے۔ بے شمار قربانیاں دے کر اس پاک وطن کی داغ بیل ڈالی تھی۔ کتنے بے گناہ اور معصوم چہروں نے اپنے ہی لہو میں غسل کیا۔ کیسے کیسے ناز و نعم میں پلے ہوئے لوگ خانہ بدوش بن کر دربدر بھٹکتے پھرے تھے۔

انگریز جو سات سمندر پار سے تاجروں کے روپ میں ہندوستان آئے تھے، انہوں نے جب ہندوستان کی زرخیز اور سونا اگلتی سر زمین دیکھی تو ان کی رال ٹپکنے لگی۔ انہوں نے تحفے تحائف دے کر ہندوستان کے حکمرانوں کو خوش کیا اور ان کے دربار تک رسائی حاصل کی۔ پھر آہستہ آہستہ تقریباً پورے ہندوستان پر قابض ہو گئے۔ چوں کہ انگریزوں نے حکومت مسلمانوں سے چھینی تھی، اس لیے وہ مسلمانوں کو ہر طرح سے دباتے رہے تاکہ انہیں انگریزوں سے ٹکرانے کا حوصلہ نہ ہو۔

مگر مسلمانوں کے دلوں میں انگریزوں کے خلاف نفرت کا لاوا اندر ہی اندر پکتا رہا اور آخر کار 1857 میں انہوں نے اپنے ان غیر ملکی آقاؤں کے خلاف بغاوت کر دی۔ مسلمانوں کے پاس نہ تو کافی اسلحہ تھا اور نہ ان کی پشت پر کوئی بڑی طاقت تھی۔ ایسے میں ان کی شکست لازمی تھی۔ جنگ آزادی میں ہندو بھی مسلمانوں کے ساتھ برابر کے شریک تھے۔ لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ شکست

● سب کہانیاں بہت اچھی تھیں۔ کیوں اور کیسے کو جاری رکھا جائے اور زیادہ سے زیادہ کہانیاں دیں۔ (عبد المالک، اسلام آباد)

● کہانیوں میں "مکھی کی گواہی"، "جھوٹی لڑکی"، پسند آئیں۔

(خرم احمد، پرنس روڈ کراچی)

● اس دفعہ کہانیوں میں سر فہرست مکھی کی گواہی اور ایمان کی قوت رہیں۔ اے۔ حمید صاحب کی سیریز "انگوٹھی کہاں گئی" بہت پسند آئی۔ کالک "شیر شاہ سوری" بھی اچھا ہے۔ پولو، کیوں اور کیسے اور فوٹوگرافی مضامین بھی پسند آئے۔ لطیفے بھی ٹھیک ٹھاک تھے۔

(عدیل ارشد، سمن آباد لاہور)

● سرورق بہت خوبصورت تھا۔ کہانیوں میں مکھی کی گواہی، ایمان کی قوت، آسیبی بلی، ظفری سائیکلوں والا، گڑیا والا پاگل اور مزاحیہ کہانی بکرا کون، بہت پسند آئیں۔ قرآنی کہانی پڑھ کر ایمان تازہ ہو گیا۔ (محمد طاہر، ڈیرہ اسماعیل خان)

● سب سے پہلے تو میری طرف سے اتنا اچھا رسالہ نکالنے پر مبارکباد قبول فرمائیں۔ کہانیوں میں "مکھی کی گواہی"، "ایمان کی قوت" اور "آسیبی بلی" بہت زیادہ پسند آئیں باقی کہانیاں بھی اچھی تھیں سلسلے وار ناول "انگوٹھی کہاں گئی" نے زیادہ متاثر نہیں کیا کیونکہ ایک تو یہ پچھلے ناول "پراسرار نقاب پوش" سے خاصی حد تک ملتا جلتا ہے اور دوسری بات یہ کہ محمد بن قاسم کی کہانی آپ کالک میں بھی دے چکے ہیں۔ (حرا ناز چشتی، کراچی)

● انگوٹھی کہاں گئی بہت اچھی لگی۔ میرا خیال ہے کہ آپ نے سرورق قبل از وقت چھاپ دیا ہے۔ کیونکہ اس دفعہ کی کہانی میں انگوٹھی دینے کا ذکر تو ابھی آیا نہیں۔ مجموعی طور پر رسالہ بہت اچھا تھا۔ کہانیوں میں جھوٹی لڑکی اور گڑیا والا پاگل بہت بہت پسند آئیں۔ جبکہ ویت نام کی لوک کہانی مکھی کی گواہی تو بہت ہی اچھی تھی۔ (عطیہ رحمان، اسلام آباد)

● جولائی کا رسالہ پڑھ کر دل خوش ہو گیا سرورق خوبصورت تھا۔ "انگوٹھی کہاں گئی"، ایک دلچسپ کہانی ہے۔ کالک شیر شاہ سوری اپنے زوروں پر ہے "آئیے، مسکرائیں" اچھا رہا۔ کہانیوں میں جھوٹی لڑکی، ظفری سائیکلوں والا، گڑیا والا پاگل اور مکھی کی گواہی اچھی تھیں۔ (علی ایاز، لاہور کینٹ)

● مکھی کی گواہی، ایمان کی قوت، جھوٹی لڑکی، گڑیا والا پاگل اور پولو تعریف کے قابل ہیں۔ نئی سیریل انگوٹھی کہاں گئی سب سے بہترین تھی۔ کالک بھی اچھا تھا۔ علمی آزمائش ختم کریں یا سوال آسان کریں۔ (لبنیٰ مشتاق، ساگری ضلع راولپنڈی)

● جولائی کے رسالے کا سرورق بہت خوبصورت تھا۔ کہانیوں میں "انگوٹھی کہاں گئی"، "جھوٹی لڑکی" اور "آسیبی بلی" بہت پسند آئیں۔ لطائف بھی بہت مزیدار تھے۔ (اسد عرفان مبارک، سیالکوٹ)

● مجھے ماہ جولائی کے رسالے میں انگوٹھی کہاں گئی، جھوٹی لڑکی، عظیم قربانی بہت پسند آئیں۔ (نعمان طارق، پشاور)

● سرورق بہت اچھا تھا۔ کہانیوں میں مکھی کی گواہی، ایمان کی قوت، ظفری سائیکلوں والا اور انگوٹھی کہاں گئی کا تو جواب نہیں۔ کالک شیر شاہ سوری بھی پسند آیا۔ (حسن علی، لاہور)

● جولائی کا تعلیم و تربیت بہت پسند آیا۔ خاص طور پر انگوٹھی کہاں گئی، آسیبی بلی، ایمان کی قوت اور عظیم قربانی کہانیاں پسند آئیں۔ کیوں اور کیسے بھی بہت پسند آیا۔ یہ جان کر بہت خوشی ہوئی کہ اے حمید کے ناول کی دو قسطیں چھاپی جائیں گی۔

(عامر حمید، علامہ اقبال ٹاؤن لاہور)

● جولائی کے رسالے کا سرورق بہت اچھا تھا۔ ایمان کی قوت، جھوٹی لڑکی، عظیم قربانی اور گڑیا والا پاگل اچھی کہانیاں تھیں۔ "کیوں اور کیسے" بہت اچھا سلسلہ ہے۔ (آسیہ اسرار، اسلام آباد)

● تمام کہانیاں بہت اچھی تھیں۔ خاص طور پر قسط وار کہانی "انگوٹھی کہاں گئی" بہت پسند آئی۔ معلوماتی سلسلہ "کیوں اور کیسے" سے معلومات میں اضافہ ہوا۔ یہ ایک اچھا سلسلہ ہے۔

(سید افتخار حسین، اسلام آباد)

● اس ماہ کے رسالے کا سرورق بہت عمدہ تھا۔ لطائف، انگوٹھی کہاں گئی، شیر شاہ سوری، مکھی کی گواہی بہت اچھی تھیں۔ آپ کو چاہیے کہ تعلیم و تربیت کے سالنامے کے ساتھ کوئی تحفہ بھی دیا کریں۔ (ایاز عبداللہ، سنگم پورہ لاہور)

● سرورق بہت عمدہ تھا۔ کہانیوں میں مکھی کی گواہی، ظفری سائیکلوں والا، انگوٹھی کہاں گئی؟، بہت مزے دار ہیں۔ شیر شاہ سوری کا تو کوئی جواب ہی نہیں۔ (محمد عاطف بھٹی، لاہور)

● نئی سیریل، انگوٹھی کہاں گئی؟ کی دونوں اقساط بے حد دلچسپ ہیں۔ مکھی کی گواہی، ایمان کی قوت اور آسیبی بلی بھی اچھی تھیں۔ باقی کہانیوں میں بکرا کون؟ اچھی تھی۔ شیر شاہ سوری بھی اچھی جا رہی ہے۔ (مسرور احمد ریحان، اسلام آباد)